www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

January 2009 • No. 386

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 250
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

جنوری 2009

فہرست

حقیقت کا اعتراف	2	زرعی دور، صنعتی دور	23
ابلیس کا چیلنج	3	سب سے بڑی محرومی	24
صبر، محاسبہ، توسم	4	نفرت، دہشت گردی	25
فرق کو جانئے	5	گھیٹو ذہنیت کا نقصان	26
لعنت کیا ہے	6	سانس کا کاروبار	27
دعوت الی اللہ،		حقیقی اِشو، غیر حقیقی اِشو	28
امر بالمعروف، نہی عن المنکر	7	فساد اور اسبابِ فساد	29
کامل خیر خواہی،		قیامت کا تجربہ	30
بے آمیز پیغام	8	کامیاب زندگی کا سفر	32
دولت پرستی کا فتنہ	9	موت کا تصور	34
تعمیرِ خویش، نہ کہ احتجاج	10	ناقص علم کا مسئلہ	35
غور و فکر ایک عبادت	12	زندگی کا خاتمہ	36
ظاہری تبدیلی، حقیقی تبدیلی	13	ہر شخص موت کا مسافر	37
مطلوب قرأت، رعایتی قرأت	14	مواقع کا استعمال	38
''نہیں''، کلچر	15	کاش ایسا ہوتا،	
اسلام کی پانچ بنیادیں	16	کاش ویسا نہ ہوتا	39
بادشاہی شوق	18	نگیٹو ایڈوانٹج لینا	40
حجرِ اسود	19	ایم فیکٹر، کیو فیکٹر	41
قیامت دستک دے رہی ہے	20	سوال و جواب	42
بگ بینگ، لٹل بینگ	22	خبرنامہ اسلامی مرکز — 191	45

حقیقت کا اعتراف

قرآن کی سورہ نمبر 43 کی ایک آیت میں ایک خدائی قانون کو بیان کیا گیا ہے۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں اُن کی روزی کو تو ہم نے تقسیم کیا ہے، اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں'' (الزّخرف: 32)۔

دنیا میں کسی شخص کو جو کچھ ملتا ہے، وہ اس کو انعام کے طور پر نہیں ملتا، بلکہ وہ اس کو امتحان کے طور پر ملتا ہے۔ مثلاً دولت، شہرت، اقتدار، وغیرہ میں برابری (equality) کا اصول نہیں ہے، بلکہ فرق (difference) کا اصول ہے۔ یہ فرق امتحانی مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان اگر دُنیوی چیزوں میں برابری ہو، تو لوگوں کے درمیان امتحان کی حالت قائم نہ ہو سکے گی، جب کہ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، امتحان کی حالت لازمی طور پر ضروری ہے۔ خدا کے قائم کردہ اِس فرق کی بنا پر، نہ کہ سازش (conspiracy) یا استحصال (exploitation) کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ دنیوی معاملات میں کوئی اوپر ہوتا ہے اور کوئی نیچے۔

اِس فرق کو ماننے کا مطلب حقیقت کا اعتراف ہے۔ حقیقت کا اعتراف کرنے سے آدمی کے اندر مثبت طرزِ فکر پیدا ہوتا ہے، اس کے اندر مثبت اخلاقیات کی پرورش ہوتی ہے، اس کے اندر مثبت شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ جو لوگ حقیقت کا اعتراف نہ کریں، وہ منفی نفسیات کا شکار ہو جائیں گے۔

اِس دنیا میں تمام مثبت فوائد حقیقت کا اعتراف کرنے والے کو ملتے ہیں۔ اِس لیے آدمی مجبور ہوتا ہے کہ وہ دل سے حقیقت کو نہ مانتے ہوئے بھی عملی طور پر اُس سے ایڈجسٹ کر لے، اِسی کا مذہبی نام منافقت ہے۔ حقیقت کا اعتراف نہ کرنا ہمیشہ نفاق کی قیمت پر ہوتا ہے، اور بلاشبہہ نفاق سے زیادہ بُری کوئی چیز اِس دنیا میں نہیں۔ ہم خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہیں، نہ کہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں۔ خدا کی دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق رہنے کی کوشش کرنا ہی تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔

ابلیس کا چیلنج

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم کے آگے جھکنے کے سوال پر ابلیس (شیطان) غصہ ہو گیا۔ اُس نے خدا سے کہا کہ مجھے موقع دیا جائے تو میں ساری نسلِ آدم کو بہکا دوں گا۔ اُس وقت اُس نے چیلنج دیتے ہوئے کہا: **ولا تجد أكثرهم شاكرين** (الأعراف: 17) یعنی تو اُن میں سے اکثر لوگوں کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا:

Most of them, You will not find grateful. (7:17)

انسان کے اوپر خدا کے ان گنت احسانات ہیں۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہوتا ہے کہ انسان اِن نعمتوں کا اعتراف نہیں کرتا اور وہ ناشکر گزار بن جاتا ہے۔ اِس کا راز خود ابلیس کے کردار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ ابلیس ایک جن تھا (الکہف: 50)۔ جنوں کے اوپر خدا کے بے شمار احسانات تھے۔ جن غیر موجود تھے، خدا نے اُن کو وجود دیا۔ جنوں کو آزادی کی نعمت دی۔ ان کو غیر معمولی اختیار بخشا۔ ان کو طویل زندگی عطا کی۔ خدا کی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ان کو تمام ضروری سامان دیے۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ ابلیس، خدا کا ناشکر گزار بن گیا۔ اِس کا راز یہ تھا کہ ابلیس پر شکایتی احساس اتنا زیادہ غالب ہوا کہ وہ خدا کے تمام انعامات کو بھول گیا۔ شکایت کے صرف ایک واقعے کو اُس نے اِس طرح جنرلائز کیا کہ اس کو شکایت کے سوا کوئی اور بات یاد ہی نہ رہی۔

ابلیس کا خاص طریقہ یہی ہے کہ وہ انسانوں کے اندر شکایتی مزاج اِس طرح بنائے کہ انسان شکایت کے ایک واقعے کو لے لے اور دوسری تمام اچھی باتوں کو نظر انداز کر کے اُسی ایک شکایتی بات کو اپنا مرکزی خیال بنا لے۔ وہ ایک منفی بات کو اِس طرح جنرلائز کرے کہ دوسری تمام مثبت باتیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں، یہاں تک کہ شکر گزاری کے بے شمار پہلوؤں کے باوجود وہ ناشکر گزار بن جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اِس طرح کے احساسِ ناشکری میں پائیں، اُنھیں یقین کرنا چاہیے کہ وہ شیطان کے زیر اثر آ گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو فوراً توبہ کر کے اپنی اصلاح کرنا چاہیے، ورنہ وہ خدا کی سخت پکڑ کی زد میں آ جائیں گے۔

صبر، محاسبہ، توسم

ایمان کے بعد مطلوب زندگی کی تعمیر کے لیے تین بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اِن تینوں چیزوں کو اختیار کیے بغیر کوئی شخص سچا مومن نہیں بن سکتا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں — صبر، محاسبہ، توسم۔

ایمان لانے کے بعد ہر مومن کے لیے سب سے پہلا مرحلہ یہ پیش آتا ہے کہ اپنے ماحول کے اندر وہ کس طرح مومنانہ زندگی گزارے۔ قانونِ فطرت کے مطابق، یہاں ہر لمحہ غیر موافق باتیں پیش آتی ہیں، ایسی باتیں جو آدمی کو بے برداشت کردیں۔ ایسے تمام مواقع پر آدمی کو صبر کرنا پڑتا ہے، تاکہ انحراف کے بغیر وہ مسلسل طور پر ایمان کے راستے پر قائم رہے۔

دوسری چیز محاسبہ (introspection) ہے۔ امتحان کی اِس دنیا میں آدمی بار بار غلطی کرتا ہے۔ اُس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ بے لاگ محاسبہ کرکے اپنی اصلاح کی جاتی رہے۔ فوری محاسبہ کے اِس عمل کے بغیر، یہ ہوگا کہ غلطیاں آدمی کی شخصیت کا حصہ بن جائیں گی اور پھر وہ کبھی اس سے جدا نہ ہوں گی۔

اِس سلسلے میں تیسری چیز توسم ہے۔ توسم کا مطلب ہے۔ غور وفکر کی زندگی گزارنا، اپنے تجربات اور اپنے آس پاس کی دنیا سے مسلسل طور پر نصیحت اور سبق لیتے رہنا۔ یہ توسم مومن کے لیے اس کی ایمانی غذا ہے۔ مسلسل توسم کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو ایمانی ترقی کے راستے کا مسافر نہیں بنا سکتا۔

اسلامی زندگی، ایمان سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ایمان، اسلامی زندگی کا صرف آغاز ہے، وہ اس کی آخری منزل نہیں۔ اِس آغاز کے بعد آدمی کو مسلسل طور پر ایک کورس سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس کورس کی تکمیل کے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی شخص مومن ومسلم کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اِس کورس کے اجزا بنیادی طور پر یہی تین ہیں — صبر اور محاسبہ اور توسم۔ یہ کورس کسی قسم کے رسمی اعمال کے ذریعے انجام نہیں پاتا۔ یہ مکمل طور پر ایک شعوری سفر ہے۔ اپنے شعور کو متحرک کرکے ہی آدمی اس امتحان میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

فرق کو جانئے

کلام کی دو قسمیں ہیں — ایک، یہ کہ آپ کسی ایسے موضوع پر بات کریں جس سے ایک آدمی کی شخصیت مطعون ہوتی ہو۔ دوسرا کلام وہ ہے جس کے ذریعے کوئی اصول متحقّق ہوتا ہو۔ پہلی قسم کا کلام ناجائز اور قابلِ ترک ہے۔ دوسری قسم کا کلام عین جائز ہے، وہ ایک صحت مند طریقہ ہے جس میں صاحبِ کلام کو ہمیشہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

جب بھی کوئی شخص آپ سے ایک ایسی بات کہے جس میں کسی آدمی کا ایک شخصی عیب بتایا گیا ہو، اُس میں شرکت کو اپنے لیے حرام سمجھئے۔ اِس طرح کی ہر بات کو خدا پر ڈال دیجیے۔ اِس طرح کی بات میں مشغول ہونے میں آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، البتہ آپ کا نقصان یقینی ہے۔ کیوں کہ کسی شخص کے بارے میں بُری رائے قائم کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

مگر دوسری نوعیت کے کلام کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ ہر وہ گفتگو جس میں کسی اصول کو زیر بحث لایا گیا ہو، جس پر چرچا کرنے سے ایک اصولی بات متحقق ہوتی ہو، ایسی گفتگو صاحبِ کلام کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ اِس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِس سے آدمی اِس قابل بنتا ہے کہ وہ حقیقتوں کو زیادہ درست طور پر سمجھ سکے۔

اِسی بات کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **إذا ظننتَ فلا تحقّق** (**المعجم الكبير للطبرانی، رقم الحديث**: 3227) یعنی جب تمھیں گمان ہو تو اس کی تحقیق نہ کرو۔ یہ حدیث شخصی نوعیت کی چیزوں کے بارے میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کو کسی شخص کے بارے میں بُرا گمان پیدا ہو تو اس کا تتبّع (persuance) نہ کرو۔ مگر جہاں تک اصولی باتوں کا تعلق ہے، اُن کا معاملہ اِس سے الگ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اصولی باتوں کا خوب چرچا کرے، تاکہ حقیقت زیادہ منقّح ہو کر سامنے آجائے، تاکہ آدمی معرفت کے زیادہ اعلیٰ مراتب تک پہنچ سکے۔ — شخصی عیب کا تتبع ذہنی پستی کا ذریعہ ہے، اور اصولی حقیقت کا تتبع ذہنی ارتقا کا ذریعہ۔

لعنت کیا ہے

قرآن کی سورہ نمبر 5 میں ایک خدائی قانون کا ذکر ہے۔ قرآن میں یہ بات یہود کے حوالے سے کہی گئی ہے، مگر اِس کا حکم عام ہے۔ اِس کا تعلق تمام اہلِ کتاب قوموں سے ہے۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، اُن پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسی بن مریم کی زبان سے، اِس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اُس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے'' (المائدة: 79-78)

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ اُن کے معاشرے میں لوگ غلط کام کریں، لیکن وہ ان کی مذمت نہ کریں تو ایسے لوگ خدا کی لعنت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ لعنت کا یہ قانون جو قرآن کی اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے، وہ کثرت سے احادیث میں آیا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ — تم کو برائی کے وقت نہی عن المنکر کا کام کرنا ہوگا۔ اور اگر تم نے برائی کے وقت نہی عن المنکر کا فرض انجام نہیں دیا تو تم بھی اُسی طرح، خدا کی لعنت کے مستحق ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے سابق اہلِ کتاب (یہود) لعنت کے مستحق ہو گئے۔ (سنن أبی داؤد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنهي)۔

لعنت کیا ہے۔ لعنت کا مطلب ہے — خیر سے دور کر دینا (الإبعاد عن الخير)۔ ایسے لوگوں کے لیے خیر سے یہ دوری دنیا میں قساوتِ قلب کی شکل میں ہوتی ہے اور آخرت میں عذابِ الٰہی کی شکل میں۔ ایسے لوگ دنیا میں شدید قسم کی بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ حق اور ناحق کے بارے میں اپنی حساسیت (sensitivity) کھو دیتے ہیں۔ اِس طرح وہ حیوان کی مانند ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ حال ہو، اُن کے اندر عملِ خیر کا جذبہ باقی نہیں رہتا۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں عذاب۔ خدا کا یہ قانون بعد کے اہلِ کتاب کے لیے بھی اُسی طرح ہے جس طرح وہ قدیم اہلِ کتاب کے لیے تھا۔ اِس معاملے میں کسی گروہ کا کوئی استثنا نہیں۔

دعوت الی اللہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر

قرآن میں اصلاح اور تبلیغ کی ذمے داریوں کو بتانے کے لیے دو مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ایک، دعوت الی اللہ اور دوسرا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ دونوں ہم معنیٰ الفاظ نہیں ہیں، بلکہ وہ دو الگ الگ ذمے داریوں کو بتانے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

دعوت سے مراد غیر مسلموں کے درمیان دعوت ہے۔ دعوت کا لفظ اُس عمل کے لیے بولا جاتا ہے جو غیر مسلموں تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا جائے۔ قرآن میں اِس کام کے لیے بعض دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً اِنذار، تبشیر اور شہادت، وغیرہ۔ دعوتی عمل کی تفصیلات اور اِس کی شرائط قرآن کے مطالعے سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُس اصلاحی عمل کا نام ہے جو مسلمانوں کے درمیان کیا جائے، یعنی مسلمانوں کے درمیان باہمی اصلاح کا عمل۔ اِس لیے اس کو تآمُر بالمعروف اور تناہی عن المنکر کے الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے (أبو داؤد، کتاب الملاحم)۔ اِس کام کا کوئی تعلق حکومت اور اقتدار سے نہیں ہے۔ ہر مسلم معاشرے کی ہر حال میں یہ داخلی ذمے داری ہے کہ وہ بقدرِ وسع، مسلمانوں کے اندر امورِ خیر کی تلقین کرے اور مسلمانوں کو ہر قسم کی برائی سے بچانے کی مسلسل کوشش کرے۔ یہ پوری طرح ایک پُرامن عمل ہے، تشدد سے اِس کا کوئی تعلق نہیں۔

دعوت کا کام نسل در نسل قیامت تک مطلوب ہے۔ یہ ایک خدائی کام ہے اور وہ اِس لیے ضروری ہے تاکہ انسانوں کے اوپر خدا کی حجت قائم ہوسکے۔ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے بعد آپ کی امت کو یہ کام اُسی طرح انجام دینا ہے، جس طرح آپ نے اپنے زمانے میں اس کام کو انجام دیا تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اِس لیے ضروری ہے کہ وہ امت کی داخلی اصلاح کی ضمانت ہے۔ قرآن کے مطابق، اِس کام کو چھوڑنا، ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس مسلم گروہ کے اندر یہ کام نہ ہو، وہ قرآن اور حدیث کی صراحت کے مطابق لعنت (المائدۃ: 79) کا مستحق ہوجائے گا۔ کوئی دوسرا عمل اِس کوتاہی کی تلافی نہیں کرسکتا۔

کامل خیرخواہی، بے آمیز پیغام

قرآن کے مطابق، داعی کے اندر دو لازمی صفات ہونا چاہیے— کامل خیرخواہی، اور بے آمیز دعوت۔ یہ بات پیغمبر کی زبان سے قرآن میں اِس طرح کہی گئی ہے: أنا لکم ناصح أمین (الأعراف: 68) یعنی میں تمھارے لیے ناصح ہوں اور امین ہوں۔

ناصح کا مطلب خیرخواہ (well-wisher) ہے۔ اور امین کا مطلب ہے انسانوں تک ٹھیک اُسی پیغام کو پہنچانا جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے۔ اِس سے کم درجے کا عمل، دعوتی عمل نہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ (debate) کوئی دعوتی عمل نہیں۔ کیوں کہ مناظرہ، فریقِ ثانی کو زیر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کا محرک فریقِ ثانی کی خیرخواہی نہیں ہوتا۔ اِسی طرح قومی کام بھی دعوت نہیں۔ کیوں کہ دعوت کا کام پوری انسانیت کی خیرخواہی کے لیے ہوتا ہے، جب کہ قومی کام صرف اپنی قوم کی خیرخواہی کے جذبے کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ کامل خیرخواہی کے سوا کسی اور جذبے سے کیا ہوا کام دعوت کا کام نہیں۔

داعی کے امین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دعوتی کلام میں کسی اور چیز کی آمیزش نہ کرے، وہ صرف خدا کی بات کو پیش کرے۔ مثلاً دعوتی کلام میں معاشی اور سیاسی شکایت جیسی باتیں شامل کرنا امانت کے خلاف ہے۔ اِس قسم کی غیر متعلق باتیں شامل کرتے ہی دعوتی کلام، غیر دعوتی کلام بن جاتا ہے۔ جو دعوتی تحریک معاشی اور سیاسی شکایت کی بنیاد پر کھڑی ہو، وہ صرف ایک قومی تحریک ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوتی تحریک۔

داعی کا ناصح ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کامل طور پر مدعو کے خلاف نفرت اور منفی احساسات سے خالی ہو۔ اُس کے دل میں وہ مثبت نفسیات ہو جس کو حضرت مسیح نے اِس طرح بیان کیا کہ تم ہر ایک سے محبت کرو، یہاں تک کہ اپنے دشمن سے بھی۔ دعوت الی اللہ کے اِس قرآنی معیار پر وہی شخص پورا اتر سکتا ہے جو کامل معنوں میں منفی نفسیات سے پاک ہو۔

دولت پرستی کا فتنہ

ایک روایت کے مطابق، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لكلّ أمّة فتنة، وفتنة أمّتي المال** (مسند احمد، جلد 4، صفحہ 160) یعنی ہر امت کا ایک فتنہ تھا، اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مال تو ہر زمانے میں انسان کے لیے فتنہ بنا رہا ہے، پھر اس کو خاص طور پر امتِ محمدی کا فتنہ کیوں کہا گیا۔ یہ خصوصیت شدت کی بنا پر ہے۔ مال کی حیثیت بلاشبہہ ہر زمانے میں فتنے کی رہی ہے، لیکن پیغمبر اسلام کی امت کا زمانہ صنعتی دور (industrial age) تک وسیع تھا۔ اِسی مستقبل کے اعتبار سے آپ نے یہ انتباہ (warning) فرمایا۔

مال کی اہمیت خرید وفروخت کے سامان کے اعتبار سے ہے۔ جدید صنعتی دور سے پہلے خرید و فروخت کے آئٹم بہت کم ہوتے تھے، اِس لیے اُس زمانے میں مال کی اہمیت بھی نسبتاً کم تھی۔ لیکن جدید صنعتی دور کے بعد خرید وفروخت کے سامانوں (consumer goods) کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اِسی کے ساتھ سامانوں کی چمک دمک میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اِس صورتِ حال نے مال کو جدید صنعتی دور میں سب سے بڑا فتنہ بنا دیا۔

قدیم زمانے میں سادہ طور پر مال کی محبت کا مسئلہ تھا، لیکن موجودہ زمانے میں مال نے پرستش کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ اب انسان کی ساری زندگی دولت رُخی (money-oriented) بن گئی ہے۔ اب مال کی کشش نے لوگوں کا یہ حال کیا ہے کہ مال ہر ایک کے لیے اس کا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنا ہوا ہے۔

ہر آدمی اپنے تمام وقت اور اپنی ساری توانائی کو زیادہ سے زیادہ مال کے حصول میں لگائے ہوئے ہے۔ اب مال نے عملاً ہر ایک کے لیے معبود کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ موجودہ زمانے کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مال کی محبت کے فتنے سے بچا سکے۔ وہ مال کو ثانوی درجے میں رکھے، اور دین کے تقاضوں کو اپنی زندگی میں اوّلین حیثیت دے۔

تعمیرِ خویش، نہ کہ احتجاج

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں ایک اصول اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **إن تصبروا وتتّقوا لایضرّکم کیدھم شیئاً** (آل عمران: 120) یعنی اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو دوسروں کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔

قرآن کی یہ آیت فطرت کے ایک قانون کو بتاتی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں سازش کا ہونا، اصل مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ صبر اور تقویٰ کا نہ ہونا ہے۔ جن لوگوں کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت موجود ہو، اُن کے لیے دوسروں کی سازش اور دشمنی غیر موثر ہو کر رہ جائے گی، وہ اُن کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

صبر کوئی انفعالی صفت نہیں۔ صبر کا مطلب وہ اعلیٰ انسانی صفت ہے جس کو سیلف کنٹرول (self control) کہا جاتا ہے، یعنی دوسروں کے پیدا کردہ مسائل سے اوپر اٹھ کر سوچنا اور خود اپنی مثبت سوچ کے تحت اپنی زندگی کا منصوبہ بنانا۔ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی سوچ خود رُخی سوچ (self-oriented thinking) نہ ہو، بلکہ وہ خدا رُخی سوچ (God-oriented thinking) ہو۔ سماج کے اندر اُس کا سلوک خدا کی تعلیمات کے مطابق ہو، نہ کہ اپنی خواہشات اور جذبات کے مطابق۔ جو لوگ صبر اور تقویٰ کی اِس روش کو اختیار کریں، اُن کے خلاف دوسروں کی منفی کارروائیاں اپنے آپ بے اثر ہو جائیں گی۔ کیوں کہ اِس دنیا کا قانون یہ ہے کہ کوئی بھی غیر مطلوب واقعہ ہمیشہ دوطرفہ کارروائی کے نتیجے میں پیش آتا ہے، نہ کہ صرف یک طرفہ کارروائی کے نتیجے میں۔

یہ فطرت کا ایک قانون ہے کہ کوئی شخص یا گروہ معتدل ذہن کے تحت کسی کے خلاف کوئی مخالفانہ کارروائی نہیں کرتا۔ ایک شخص یا گروہ کسی دوسرے کے خلاف کوئی منفی کارروائی صرف اُس وقت کرتا ہے، جب کہ اُس کو بھڑکا دیا گیا ہو۔ ہر منفی کارروائی کسی اشتعال انگیز کارروائی کے نتیجے میں جوابی طور پر پیش آتی ہے۔ صبر اور تقوی آدمی کو اِس سے روکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص یا گروہ کے خلاف

اشتعال انگیز کارروائی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ صبر اور تقویٰ کسی شخص یا گروہ کے لیے حفاظت کا یقینی ذریعہ ہے۔ ایسا شخص یا گروہ کسی بھی حال میں دوسرے کو مشتعل کرنے والا کام نہیں کرے گا، اِس لیے فطری طور پر وہ دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی جوابی کارروائی سے بھی محفوظ رہے گا۔

یہ فطرت کا قانون ہے جس کو خود خالقِ فطرت نے مقرر کیا ہے۔ ایسی حالت میں سازش کے خلاف چیخ و پکار کرنا ایک بے فائدہ کام ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو داخلی طور پر مستحکم بنایا جائے، خود اپنے اندر زیادہ سے زیادہ صبر اور تقویٰ کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ اِس کے بعد شکایت کے اسباب اِس طرح ختم ہو جائیں گے، جیسے کہ وہ تھے ہی نہیں۔

خدا کے تخلیقی پلان (creation plan) کے مطابق، زندگی میں ہمیشہ دو مختلف قسم کی چیزیں موجود رہتی ہیں— مسائل (problems) اور مواقع (opportunities)۔ جس طرح زندگی میں ہمیشہ مسائل موجود رہتے ہیں، اسی طرح زندگی میں ہمیشہ مواقع بھی موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں دانش مندی کا طریقہ، اسلام کے مطابق، یہ ہے کہ— مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو استعمال کیا جائے۔ مسائل سے الجھنا، صرف اُس وقت کو ضائع کرنا ہے جو اِس دنیا میں ہم کو زندگی کی مثبت تعمیر کے لیے ملا ہوا ہے۔ یہی دانش مندی ہے اور یہی اسلام کا طریقہ بھی۔

ہندی ترجمہ قرآن

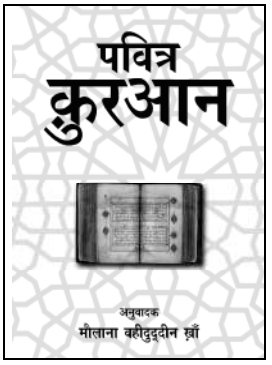

زیر نظر ترجمہ، ہندی زبان میں قرآن کا سلیس اور آسان ترجمہ ہے۔ عوام الناس کا خیال رکھتے ہوئے ہندی کے مشکل الفاظ سے اجتناب کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ عام فہم زبان میں ہونے کی بنا پر عوام اور خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

ہدیہ: صرف -/25 روپے

غور وفکر ایک عبادت

أخرج أبو نُعيم في الحِلية (164/1) عن محمد بن واسع: أنّ رجلاً من البصرة ركب إلى أمِّ ذر رضي الله عنها بعد وفاة أبي ذر رضي اللّٰه عنه، يسألها عن عبادة أبي ذر، فأتاها فقال: جئتكِ لتخبرينى عن عبادة أبي ذر، قالت: كان النّهار أجمع خالياً يتفكر (حياة الصحابة، جلد2، صفحہ 627)۔

ترجمہ: محمد بن واسع کہتے ہیں کہ ابوذر صحابی کی وفات کے بعد ایک آدمی بصرہ سے سفر کر کے أمِّ ذر (اہلیہ ابوذر) کے پاس آیا، تاکہ وہ ابوذر کی عبادت کے بارے میں اُن سے معلوم کرے۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا کہ میں آپ کے پاس اِس لیے آیا ہوں، تاکہ آپ مجھ کو ابوذر کی عبادت کے بارے میں بتائیں۔ امِّ ذر نے کہا کہ وہ سارے دن تنہائی میں بیٹھ کر غور وفکر کرتے تھے۔

اِس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ رسول کی خصوصی عبادت کیا ہوتی تھی۔ وہ وہی چیز ہوتی تھی جس کو قرآن میں تفکر، تذکر، تدبر، توسم اور تعقل جیسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی فطرت (nature) میں اور دینی امور میں غور کرتے رہنا، غور وفکر کے ذریعے ہر روز اپنے لیے ربانی غذا حاصل کرنا، متعین عبادات کے سوا، غیر متعین عبادت میں مشغول رہنا۔

انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے رُٹین (routine) کا طالب ہے۔ اُس کا ہر کام رٹین کے تحت ہوتا ہے۔ اِس لحاظ سے، پانچ وقت کی نماز گویا کہ رُٹین کی نماز ہے۔ یہ رٹین بلاشبہہ ضروری ہے، مگر عبادت اپنی حیثیت کے اعتبار سے، ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ یہی تسلسل، مومن کی زندگی میں غور وفکر کے ذریعے جاری رہتا ہے۔ آدمی ہر لمحہ مختلف قسم کے مشاہدات اور تجربات سے گزرتا ہے۔ اِس دنیا کے ہر مشاہدے اور تجربے میں خدا کی تجلی شامل رہتی ہے۔ یہی تجلیات جب زندہ احساس بن جائیں تو اُس کو ذکر وفکر کہا جاتا ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جس کو قرآن کی اِس آیت میں انسان کی تخلیق کا مقصد قرار دیا گیا ہے: **وما خلقت الجنّ والإنس إلا ليعبدون (الذّاريات: 56)۔**

ظاہری تبدیلی، حقیقی تبدیلی

ہفت روزہ امریکی میگزین ٹائم (17 نومبر 2008) کی کور اسٹوری نئے امریکی صدر بیرک اوباما (Barack H. Obama) پر ہے۔ صدارتی مہم کی تکمیل پر 5 نومبر 2008 کو یہ اعلان کیا گیا کہ بیرک اوباما، امریکا کے چوالیسویں صدر منتخب ہوگئے ہیں۔ انھوں نے کامیابی کے فوراً بعد شکاگو میں ایک بڑے مجمع کے سامنے اپنی پہلی پبلک تقریر کی۔ تقریر کا آغاز انھوں نے اُس مشہور جملے سے کیا جس کو ٹائم نے اپنے ٹائٹل پر بیرک اوباما کی تصویر کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اُن کی تقریر کا پہلا جملہ یہ تھا— تبدیلی امریکا تک پہنچ گئی:

Change Has Come to America

اِس موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کچھ لوگوں سے کہا کہ یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ امریکا میں جو چیز بدلی ہے، وہ صرف وہاں کی صدرات ہے، نہ کہ وہاں کے حالات۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ اِس طرح کہا جائے کہ:

Change has come to American presidency.

انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ لوگ ظاہری تبدیلی کو حقیقی تبدیلی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پانچ سال تک بیرک اوباما اِسی طرح پُر شور الفاظ بولتے رہیں گے، یہاں تک کہ جب پانچ سال پر اُن کا دورِ صدارت ختم ہوگا تو معلوم ہوگا کہ حقیقی معنوں میں کوئی بھی ایسا کام نہیں ہوا، جس کو تبدیلی (change) کہا جاسکے، امریکا کے اصل مسائل بدستور موجود ہیں، بلکہ اُن میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

زندگی میں حقیقی تبدیلی عمومی حالات میں تبدیلی سے آتی ہے، نہ کہ صدر یا وزیر اعظم کے بدلنے سے۔ لوگ عام طور پر اِس فرق کو نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ لوگ پہلے جشنِ فتح مناتے ہیں، اور آخر میں مایوس ہوکر اگلے الیکشن میں اُسی شخص کو ہرا دیتے ہیں جس کی انتخابی جیت کو انھوں نے حقیقی تبدیلی کے ہم معنیٰ سمجھ لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں تبدیلی، انسان میں تبدیلی سے آتی ہے، نہ کہ سیاسی عہدے داروں کی تبدیلی سے۔

مطلوب قرأت، رعایتی قرأت

حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ اِس کو قرأتِ سبعہ کی روایت کہا جاتا ہے۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ مختلف عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن قبائل کی زبان مشترک طور پر عربی تھی، لیکن ہر ایک کا لہجہ الگ الگ تھا، جیسا کہ ہر زبان میں ہوتا ہے۔ جب قرآن لوگوں کے درمیان پھیلا تو ہر ایک اپنے اپنے قبیلے کی زبان میں اُس کو پڑھنے لگا۔ اِس پر لوگوں کے درمیان اختلافات ہوئے۔ لوگ، رسول اللہ ﷺ سے ایک لہجے میں قرآن کو سنتے تھے اور صحابہ اس کو دہراتے تو وہ مختلف لہجات میں اس کو دہراتے۔ یہ اختلاف بعض اوقات شدت اختیار کر لیتے تھے، یہاں تک کہ عمر فاروق نے ایک بار ایک صحابی کو اپنے سے مختلف لہجے میں قرآن کو پڑھتے ہوئے سنا تو انھوں نے کہا: **کذبتَ**۔

جب یہ اختلاف بڑھا تو لوگ اِس مسئلے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ نے ہر ایک کے قرآن کو پڑھوا کر سنا اور پھر ہر ایک کے لہجے کی تصویب فرمائی (**فأیّ ذلک قرأتم أصبتم، فلا تماروا فیه**) آپ نے کہا کہ تم جس طرح پڑھتے ہو، اُسی طرح پڑھو، کیوں کہ قرآن سات لہجوں میں اتارا گیا ہے (**إنما أنزل القرآن علی سبعة أحرف**) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: **فتح الباری لابن حجر العسقلانی**، جلد 8، صفحہ 639۔

اِس سلسلے کی مختلف روایات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سات قرأت کا مطلب، سات مطلوب قرأت نہیں ہے، بلکہ سات رعایتی قرأت ہے۔ قرآن کی مطلوب قرأت صرف وہی ہے جو قبیلۂ قریش کے لہجے کے مطابق ہے۔ کیوں کہ عرب میں قریش کا لہجہ ہی اسٹینڈرڈ لہجہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ زبان کا لہجہ ابتدائی عمر میں بن جاتا ہے۔ کوئی آدمی بعد کی عمر میں اپنے لہجے کو بدلنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اِس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ جہاں تک قرآن کی کتابت کا معاملہ ہے، اُس کو قریش کے اسٹینڈرڈ لہجے کے مطابق لکھا جائے گا، البتہ رعایتی طور پر لوگوں کو اجازت ہوگی کہ لوگ اپنے اپنے قبیلے کے لہجے کے مطابق، قرآن کو پڑھیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو مذکورہ حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **فاقرؤا ما تیسر منه**۔

''نہیں'' کلچر

آج کل ایک چیز بہت عام ہے، وہ ہے— نہیں کلچر، یعنی ایک بات کے لیے پہلے نہیں کہنا، مگر جب اس کی اسکروٹنی (scrutiny) کی جائے، تو پھر ہاں کہہ دینا۔ یہ نہیں کلچر موجودہ زمانے میں بہت زیادہ عام ہے۔ وہ مذہبی لوگوں میں بھی اتنا ہی پایا جاتا ہے، جتنا کہ سیکولر لوگوں میں۔

موجودہ زمانے کا ایک فیشن ''سفید پوشی'' ہے، یعنی اپنے آپ کو خوب صاف ستھرا بنا کر رکھنا۔ یہ مزاج جسمانی آرائش سے گزر کر، باطنی آرائش تک پہنچ گیا ہے۔ ہر عورت اور مرد، شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان ان کی تصویر (image) اچھی بنی رہے۔ وہ سماج میں اچھے انسان سمجھے جائیں۔ اِسی ذہن نے مذکورہ کلچر پیدا کیا ہے۔

ہر آدمی سے چھوٹی یا بڑی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اِس طرح کی غلطیوں کا فطری حل یہ ہے کہ آدمی فوراً ہی اپنی غلطی مان لے۔ وہ کھلے لفظوں میں یہ کہہ دے کہ— میں غلطی پر تھا۔ لیکن لوگوں کے درمیان اپنے آپ کو اچھا بنائے رکھنے کا ذہن اتنا زیادہ چھایا ہوا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے اپنی زبان سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، تو میری تصویر (image) خراب ہو جائے گی۔ اِس لیے وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

یہ ایک مہلک قسم کی اخلاقی کم زوری ہے۔ اِس کم زوری کی قیمت یہ دینی پڑتی ہے کہ آدمی کو بار بار جھوٹ بولنا پڑتا ہے، یا تو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا، یا وہ بعد کو گھما پھرا کر یا توڑ مروڑ کر اس کو کہتا ہے، جس کو انگریزی میں ٹوسٹ (twist) کرنا کہتے ہیں۔

اِس عادت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی کے اندر کم زور شخصیت (weak personality) بنتی ہے۔ اِس قسم کی کم زور شخصیت آدمی کے روحانی ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسے عورت اور مرد اُس نعمت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں جس کو اعلیٰ روحانی شخصیت کہا جاتا ہے۔ اِسی اعلیٰ روحانی شخصیت کا دوسرا نام جنتی شخصیت ہے۔

اسلام کی پانچ بنیادیں

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بُني الإسلامُ علىٰ خمس: شهادة أن لا إلٰه إلّا الله، وأنّ محمداً عبده ورسولهُ، وإقامِ الصلاة، وإيتاء الزّكاةِ، والحجِّ، وصَومِ رمضانَ'' (صحيح البخاری، مسلم، الترمذی، النسائی)۔

یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے— اِس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور محمد اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا، اور زکوٰۃ ادا کرنا، اور حج کرنا، اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اِس حدیثِ رسول میں جن پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب عقیدے اور عبادت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اِن میں خلافت اور حکومت کا کوئی ذکر نہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خلافت اور حکومت کی حیثیت اسلام کی عمارت کے ستون کی نہیں ہے۔ قرآن کے لفظوں میں وہ ایک ''شیئ آخر'' (الصّف: 13) ہے، یعنی ثانوی چیز۔ اِس کے مطابق، مذکورہ پانچ ارکان، اسلام کی تعمیر میں ستون کی حیثیت رکھتے ہیں اور حکومت کی حیثیت صرف ثانوی (secondary) ہے، یعنی وہ حاصل ہو جائے تب بھی ٹھیک ہے اور حاصل نہ ہو تب بھی ٹھیک ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سیاسی اقتدار ہمیشہ کسی ایک گروہ کے پاس نہیں رہتا، وہ بدلتا رہتا ہے، یعنی کبھی ایک گروہ کے پاس اور کبھی دوسرے گروہ کے پاس (وتلك الأيّامُ نداولها بين الناس، آل عمران: 140)۔ اِس قرآنی آیت کا تعلق، غلبہ اور اقتدار سے ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ غلبہ اور اقتدار پر کسی ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی، وہ لوگوں کے درمیان بدلتا رہتا ہے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ اِس دنیا میں جو چیزیں انسان کو ملتی ہیں، وہ بطور انعام نہیں ملتیں، بلکہ وہ پرچۂ امتحان کے طور پر ملتی ہیں۔ یہی حیثیت غلبہ واقتدار کی بھی ہے۔ قرآن کے مطابق، حضرت سلیمان کو غلبہ واقتدار عطا ہوا تھا، مگر انھوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ ہم کو بطور انعام ملا ہے، بلکہ انھوں نے یہ کہا کہ وہ

ہم کو امتحان کے طور پر ملا ہے: لیبلونی أ أشکر أم أکفر (النّمل: 45) یعنی خدا نے جو اقتدار مجھ کو عطا فرمایا ہے، وہ اِس لیے ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ اُس کو پا کر میں شکر و اعتراف کا اظہار کرتا ہوں یا اُس کی ناشکری کر کے سرکش اور متکبّر بن جاتا ہوں۔

قرآن کی سورہ نمبر 22 میں ارشاد ہوا ہے: ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو اگر ہم زمین میں غلبہ دیں تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے'' (الحجّ: 41)۔

اِس آیت میں 'تمکین' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد سیاسی اقتدار ہے۔ سیاسی اقتدار پانے کے بعد جن کاموں کو مسلمانوں کا کام بتایا گیا ہے، وہ آیت کے الفاظ کے مطابق یہ ہیں — اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

یہ کُل چار کام ہیں۔ یہ چاروں کام وہ ہیں جن کا کوئی براہِ راست تعلق، سیاسی اقتدار سے نہیں۔ اِن چاروں کاموں کے بارے میں یہ مطلوب ہے کہ وہ ہر مسلم معاشرے میں اور ہمیشہ جاری رہیں، پھر یہاں اِن کاموں کو سیاسی اقتدار کے ساتھ کیوں بیان کیا گیا۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی اقتدار پانے کے بعد بھی مسلمانوں کو وہی کام جاری رکھنا ہے جو وہ سیاسی اقتدار کے بغیر کر رہے تھے، یعنی سچے اہلِ ایمان کو اگر سیاسی اقتدار مل جائے تب بھی وہ گھمنڈ میں نہیں پڑیں گے، وہ سرکشی نہیں کریں گے، وہ اقتدار کو کسی غلط کام میں استعمال نہیں کریں گے، بلکہ وہ اُنھیں دینی کاموں کو جاری رکھیں گے جو وہ اقتدار سے پہلے کر رہے تھے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اقتدار کی حیثیت اُس کے اضافی حصہ (relative part) کی ہے۔ جہاں تک اصل اسلام کا تعلق ہے، وہ تقویٰ اور عبادت اور اخلاقیات پر قائم ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا درست ہوگا کہ — اسلام اپنی نوعیت کے لحاظ سے روحانی نظام (spiritual system) سے قریب تر ہے، نہ کہ سیاسی نظام (political system) سے۔

بادشاہی شوق

ایک بار میں پرانی دلّی میں ایک صاحب کے یہاں گیا۔ ہم دونوں گھر کی چھت کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ پڑوس کے مکان کی چھت پر ایک مسلمان لڑکا کبوتر اڑا رہا تھا اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہا تھا۔ میں نے اُس لڑکے سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ لڑکے نے جواب دیا— باشّاہی شوق ہے۔ یہ جواب میری سمجھ میں نہیں آیا، تو صاحبِ مکان نے بتایا کہ وہ کہہ رہا ہے— بادشاہی شوق ہے، یعنی میں کبوتر اڑا رہا ہوں، اور کبوتر اڑانا، بادشاہی شوق ہے۔

میرے تجربے کے مطابق، موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمانوں کا مزاج یہی ہے۔ آج کل کے مسلمان، خواہ وہ کسی بھی خطے میں ہوں، وہ اپنے اندر بادشاہی مزاج لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جو تاریخیں پڑھتے ہیں، اُن میں قدیم مسلم بادشاہوں کے کارنامے درج کیے جاتے ہیں۔ اُن کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اُن کو بادشاہی دور کی کہانیاں سناتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا پورا ماحول بادشاہی روایات کے تحت بنا ہے۔ ہر ایک اِسی انداز میں سوچتا ہے، خواہ وہ اپنی زبان سے اِس قسم کے الفاظ بولے یا نہ بولے۔ اسلامی مزاج تواضع کا مزاج ہے۔ اِس لحاظ سے، بادشاہی مزاج سرتاسر اسلامی مزاج کے خلاف ہے۔

اِس قسم کے مزاج نے مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں بے جوڑ (unfit) بنا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ جمہوریت کا زمانہ ہے، لیکن مسلمان شہنشاہیت کے مزاج میں جی رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ امن کا زمانہ ہے، لیکن مسلمان تشدد کے مزاج میں جی رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ ایڈجسٹمینٹ کا زمانہ ہے، لیکن مسلمان اِس کے برعکس مزاج میں جی رہے ہیں۔ اِس مزاج کا نتیجہ دو برائیوں کی صورت میں نکلا ہے— کچھ مسلمان اِس مزاج کو لے کر دوسروں سے لڑ رہے ہیں، اور کچھ مسلمان اپنے اِس قومی مزاج کے باوجود مفاد پرستانہ جذبے کے تحت بظاہر دوسروں سے موافقت کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر ہلاکت خیز ہیں۔

حجرِ اسود

ایک ہندو بھائی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے کعبہ میں بھی وہی سب کچھ ہوتا ہے جو ہمارے یہاں مندروں میں ہوتا ہے۔ مندر میں بت ہوتا ہے، کعبہ میں بھی ایک بت ہے جس کو آپ لوگ حجر اسود کہتے ہیں۔ میں نے ہندو بھائی کی بات ٹھنڈے طریقے سے سنی۔ میں نے ان کے اعتراض کا فوراً جواب نہیں دیا، بلکہ پہلے خود انھیں سے اس کے متعلق کچھ سوالات کیے۔

میں نے کہا کہ آیئے سب سے پہلے یہ طے کرلیں کہ بت کیا ہے اور بت پرستی کس کو کہتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے بعد خود ان کے جوابات کی روشنی میں بت کی جو تعریف مقرر ہوئی، وہ یہ تھی:

بت وہ ہے جس کو مقدس سمجھ کر اس کی پرستش کی جائے۔

بت وہ ہے جس کو عالم اسباب پر مؤثر سمجھ کر اس سے مرادیں مانگی جائیں۔

ان الفاظ کو کاغذ پر لکھ لینے کے بعد میں نے انھیں دکھایا۔ جب انھوں نے اس تعریف کی تصدیق کردی تو میں نے کہا کہ یہ بتایئے کہ آپ نے کبھی کسی حاجی سے یہ پوچھا ہے کہ حجر اسود کو تم کیا سمجھتے ہو اور وہاں جا کر تم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔

میں نے کہا پھر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کوئی بھی مسلمان حجر اسود کو ان دونوں حیثیتوں میں سے کوئی حیثیت نہیں دیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کبھی کسی مسلمان نے نہ اس طرح حجر اسود کی پوجا کی ہے جس طرح مندروں میں بت کی پوجا کی جاتی ہے اور نہ کبھی کسی مسلمان نے حجر اسود سے اس طرح مراد مانگی ہے جس طرح مندر میں بت سے مراد مانگی جاتی ہے۔

اس کے بعد میں نے بتایا کہ حجر اسود کی حیثیت صرف ایک نشان (symbol) کی ہے۔ حج یا عمرہ میں مسلمان کعبہ کے گرد سات بار طواف کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ طواف کے لیے کوئی نقطۂ آغاز (starting point) مقرر کیا جائے۔ حجر اسود یہی اسٹارٹنگ پوائنٹ ہے۔ ہر طواف حجر اسود سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہوتا ہے۔

قیامت دستک دے رہی ہے

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ اپنے خاتمہ (end) پر پہنچ گئی ہے۔ اکیسویں صدی غالباً انسانی تاریخ کی آخری صدی ہے۔ اِس کے بعد انسان کے اوپر شاید بائیسویں صدی آنے والی نہیں۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ برائی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی ہے، اور جب برائی اپنی آخری حد تک پہنچ جائے تو انسان، خدا کی زمین پر مزید بسنے کا جواز (justification) کھو دیتا ہے۔

اِس معاملے میں غیر مسلموں کو جانچنے کا معیار اخلاقی معیار ہے۔ اخلاقی معیار کے اعتبار سے، آخری چیز حیا ہے۔ جب لوگوں کے اندر حیا کی صفت باقی نہ رہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ برائی کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ ہم جنسی (homosexuality) کو یکساں جنس (same sex) قرار دے کر اس کو قانونی طور پر جائز بنایا جارہا ہے۔ عریانیت (nudity) اور فحّاشی (pornography) اب کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔ آرٹ اور آزادی کے نام پر ہر اخلاقی برائی کو جواز کا درجہ دیا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال، اخلاقی شناعت کی آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ جب انسان اخلاقی برائی کے اِس درجے تک پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کے لیے خدا کی زمین پر مزید بسنے کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اِس معاملے میں ان کے لیے جو معیار ہے، وہ شرعی معیار ہے۔ اِس شرعی معیار کو قرآن اور حدیث میں انکارِ منکر کہا گیا ہے، یعنی جب کچھ افراد برائی میں مبتلا ہوں تو دوسرے لوگ اس کی سخت مذمت کریں۔ وہ کھلے طور پر اس کو کنڈم کریں۔ برائی کو دیکھنے یا جاننے کے بعد اُس پر خاموش رہنا اور اس کی کھلی مذمت نہ کرنا، ایک ایسا فعل ہے جو پوری قوم کو لعنت کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہ بات قرآن اور حدیث میں واضح طور پر موجود ہے، حتی کہ یہ معاملہ اتنا سخت ہے کہ اگر دوسرے لوگ اِس طرح کی برائی کے معاملے میں اعلان کے ساتھ اُس سے اظہارِ برأت (disown) نہ کریں تو نسل در نسل وہ اُس برائی میں شامل سمجھے جائیں گے، وہ اُس وقت تک بری الذمہ قرار نہیں پائیں گے،

جب تک وہ اعلان کے ساتھ اُس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار نہ کریں۔ دونوں ہی طبقے کا کیس مشترک طور پر شدید بے حسی کا کیس ہے۔ ایک طبقے میں اِس بے حسی کا اظہار اخلاقی بے حیائی کی صورت میں ہو رہا ہے اور دوسرے طبقے میں انکارِ منکر کے فریضے کو ترک کرنے کی صورت میں۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں انکارِ منکر نہ کرنے کی صفت آخری حد تک عام ہو چکی ہے۔ جدید میڈیا نے اس معاملے میں مسلمانوں کا عالمی ایکسپوژر (universal exposure) کر دیا ہے۔ یہ بم دھماکے کے واقعات ہیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمان جگہ جگہ بم دھماکے کر رہے ہیں۔ عرب دنیا میں فلسطین کے اِشو کو لے کر بم دھماکے کیے جا رہے ہیں۔ اِسی طرح، پاکستان اور افغانستان اور کشمیر میں بم دھماکے جاری ہیں۔ آج کل ہندستان میں بھی جگہ جگہ بم دھماکے ہو رہے ہیں۔ اِن بم دھماکوں میں بے قصور لوگ مرتے ہیں، جب کہ بے قصور لوگوں کو مارنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک بے قصور کو مارنا گویا کہ تمام انسانوں کو مار ڈالنا ہے (المائدۃ: 32)۔

اِس قسم کے بم دھماکے لمبی مدت سے جگہ جگہ ہو رہے ہیں، مگر معلوم طور پر ساری دنیا میں کوئی بھی نہیں جو اِن واقعات پر حقیقی معنوں میں انکارِ منکر کا فریضہ انجام دے رہا ہو، یعنی غیر مشتبہ انداز میں اور متعین طور پر ایسے لوگوں کی مذمت کرنا۔ مسلمانوں میں جو لکھنے اور بولنے والے لوگ ہیں، وہ جب بھی لکھتے اور بولتے ہیں، وہ اِس انداز میں لکھتے اور بولتے ہیں جس سے ایسے مسلمانوں کو سندِ جواز مل جائے، یعنی ٹوسٹ (twist) کر کے بولنا، قیاس کی بنیاد پر کلام کرنا، غیر متعین اور غیر مشخص انداز میں تبصرہ کرنا، سرے سے واقعے کا انکار کرنا، ایسے واقعات کو پولس اور میڈیا کی سازش بتانا، مسلمانوں کے فعل پر اُن کی مذمت کرنے کے بجائے اس پر خاموش رہ کر اسلامی تعلیمات کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہے، وغیرہ۔

مسلمان، شرعی معیار کی بنیاد پر اِس دنیا میں اپنے لیے حقِ زیست کھو چکے ہیں، اور غیر مسلم، اخلاقی معیار کی بنیاد پر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اُنھیں اِس دنیا میں مزید مہلتِ حیات ملنے کا کوئی جواز نہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قیامت ہمیں دروازے پر پہنچ کر دستک دے رہی ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ کب وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائے۔

بگ بینگ، لٹل بینگ

انسان ہمیشہ یہ سوچتا رہا ہے کہ موجودہ کائنات کیسے بنی۔ وہ عقلی سطح پر اِس کا جواب پانا چاہتا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں پہلی بار انسان کو اِس کا عقلی جواب ملا۔ فلکیاتی سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ تقریباً 13 بلین سال پہلے، خلا میں ایک انفجار (explosion) ہوا۔ اِس انفجار کو عام طور پر بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔ فلکیاتی سائنس کے اعتبار سے، اِسی بگ بینگ کے بعد بتدریج موجودہ کائنات وجود میں آئی۔

تاہم ایک سوال کا عقلی جواب ابھی باقی تھا، وہ یہ کہ ہمارا شمسی نظام (solar system) کیسے بنا۔ شمسی نظام، ساری کائنات میں ایک استثنائی نظام ہے۔ اِس نظام کے اندر سیارۂ زمین ایک انتہائی استثنائی قسم کا سیارہ ہے۔ علماءِ فلکیات اِس بات کی عقلی توجیہ نہیں کر سکے تھے کہ کائنات میں استثنائی قسم کا موجودہ شمسی نظام کیسے بن گیا۔

بگ بینگ کی دریافت کے تقریباً سو سال بعد، اکیسویں صدی کے ربع اول میں، سائنس دانوں نے سوئزرلینڈ میں کچھ خصوصی تجربات کیے۔ اِن تجربات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ بگ بینگ کے واقعے کے بہت بعد خلا میں ایک چھوٹا انفجار ہوا۔ اِس کو سائنس دانوں نے لٹل بینگ (Little Bang) کا نام دیا ہے۔ اِس لٹل بینگ کے بعد شمسی نظام وجود میں آیا اور بتدریج وہ استثنائی سیارہ بنا جس کو زمین (planet earth) کہا جاتا ہے۔

بگ بینگ اور لٹل بینگ کی یہ دونوں سائنسی دریافتیں بتاتی ہیں کہ کائنات کی تخلیق ایک اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کے ذریعے ہوئی۔ یہ کائنات کسی اتفاق (accident) کے ذریعے وجود میں نہیں آئی، بلکہ وہ ایک بالقصد منصوبے کے ذریعے وجود میں آئی۔ یہ واقعہ اپنے آپ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس کائنات کی ایک منزل ہے۔ یہ کائنات پورے معنوں میں ایک بامعنیٰ کائنات ہے، اور ایک بامعنیٰ کائنات کسی بے معنی انجام پر ختم نہیں ہو سکتی۔

زرعی دور، صنعتی دور

تاریخ کو اقتصادی اعتبار سے دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے، زرعی دور (agricultural age) اور صنعتی دور (industrial age)۔ دونوں دوروں میں ایک بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ زرعی دور میں، انسانی اقدار (human values) بڑے پیمانے پر پائی جاتی تھیں۔ موجودہ صنعتی دور میں انسانی اقدار کا تقریباً خاتمہ ہو گیا ہے۔ پچھلے دور میں عام طور پر لوگ دوسرے انسانوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ اب ہر شخص محو بالذات (self centred) نظر آتا ہے۔

اِس فرق کا سبب بنیادی طور پر یہ ہے کہ زرعی دور میں انسان دیکھتا تھا کہ وہ تھوڑی سی محنت کرتا ہے اور اس کے بعد جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس میں سارا حصہ زمین کا یا نیچر کا ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بظاہر اس کے برعکس معاملہ نظر آتا ہے۔ اب انسان یہ دیکھتا ہے کہ اپنی پوری زندگی کے بڑے حصہ میں وہ اپنا کیریر بنانے کے لیے محنت کرتا ہے۔ اور پھر اس کو جو کچھ ملتا ہے وہ بظاہر اس کی اپنی محنت اور لیاقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلے زمانے کا انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اس کو جو کچھ حاصل ہو رہا ہے، وہ کسی اور کے دینے سے حاصل ہو رہا ہے۔ اِس کے برعکس، آج کا انسان محسوس کرتا ہے کہ اے سے زیڈ تک، سب کچھ، وہ اپنی لیاقت کے ذریعے حاصل کر رہا ہے۔

اِسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ پہلے زمانے میں لوگوں کے اندر خلقِ خدا کے لیے ہمدردی پائی جاتی تھی۔ مگر آج کے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ خود غرضی کے انداز کے سوا کسی اور انداز میں سوچنا نہیں جانتا۔ پہلے زمانے کا انسان اپنی پیداوار میں خالق کا حصہ سمجھتا تھا اور اس کو نکال کر دوسرے انسانوں کو دیتا تھا۔ مگر آج کا انسان جو کچھ کماتا ہے، اس کو وہ کامل طور پر صرف اپنا کارنامہ سمجھتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس احساس میں جیتا ہے کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے، وہ صرف میری اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔ اِس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہیں۔

سب سے بڑی محرومی

17 ستمبر 2008 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے میر تقی میر ہال میں مسلم مسائل پر ایک سمینار تھا۔ اِس میں مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ ان میں باریش مسلمان بھی تھے اور بے ریش مسلمان بھی۔ اِس کا پورا پروگرام انگریزی زبان میں ہوا۔ میں بھی اِس پروگرام میں شریک تھا۔ تمام مقررین نے بلا استثنا، ہندستانی مسلمانوں کو ایک مظلوم کمیونٹی بتایا۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا کے مسلمان محاصرہ (siege) کی حالت میں ہیں۔ ہر ایک نے مختلف الفاظ میں، مسلمانوں کی نسبت سے اِسی قسم کی منفی باتیں کیں۔

میں غم کے احساس میں ڈوبا ہوا لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں پہلی بار 1943 میں دہلی آیا تھا۔ اُس وقت میں نے پہلی بار جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دیکھا۔ اُس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات: 1969) سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ اُس وقت جامعہ ایک معمولی کالج کی طرح تھا۔ نامنظور ادارہ ہونے کی بنا پر اس کی ڈگری کی بھی جاب مارکیٹ میں کوئی ویلو نہیں تھی۔ آج 65 سال بعد یہاں جامعہ ملیہ کے نام سے ایک عالی شان یونی ورسٹی بنی ہوئی ہے۔ پہلے کے مقابلے میں آج جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تقریباً سو گنا ترقی کی ہے۔ اس کی یہ تمام ترقیاں آزادی کے بعد نئے انڈیا میں ہوئی ہیں۔

مذکورہ سمینار جامعہ کے ایک شان دار ہال میں ہوا۔ اِس ماحول میں لوگوں کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جامعہ ملیہ علامتی طور پر یہ بتا رہا ہے کہ اس ملک میں مسلمان مسلسل ترقی کر رہے ہیں، یہ صورتِ حال شکر کا تقاضا کرتی ہے، پھر کیوں ایسا ہوا کہ ایک ترقی یافتہ مسلم ادارے میں بیٹھ کر لوگ اس طرح ناشکری کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے اندر خدا کا خوف نہیں، ورنہ حدیثِ رسول کے مطابق، اُنھیں ڈرنا چاہیے کہ اگر اُن کے اندر شکرِ انسانی نہ ہو تو وہ شکرِ خداوندی کے جذبے سے محروم ہو جائیں گے۔ اور بلاشبہہ شکر خداوندی کے جذبے سے محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ اِس حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **مَن لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ** (مسند احمد، جلد 4، صفحہ 278) یعنی جو آدمی انسان کا شکر گزار نہ ہو، وہ خدا کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔

نفرت، دہشت گردی

نفرت (hate) اور دہشت گردی (terrorism) دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نفرت، منفی سوچ کا نتیجہ ہے، اور دہشت گردی منفی عمل کا نتیجہ۔ نفرت منفعل دہشت گردی (passive terrorism) ہے، اور دہشت گردی عملی نفرت (terrorism in action) کا نام ہے۔ منفی سوچ داخلی طور پر نفرت ہے اور خارجی اعتبار سے دہشت گردی۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھیے تو جو لوگ نفرت کی باتیں کرتے ہیں، وہ زیادہ بڑے مجرم ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ نفرت کی بولی بول کر لوگوں کو مشتعل کرتے رہتے ہیں اور یہی اشتعال مزید بھڑک کر دہشت گردی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

منفی سوچ کیا ہے۔ منفی سوچ نفسیاتی ہلاکت کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ انسانوں کے اندر منفی سوچ پیدا کریں، وہ انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ کیوں کہ منفی سوچ آدمی کے اندر تعمیری سوچ کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ سماج کے اندر معتدل مزاج کے ساتھ نہیں رہ سکتے، اور جن لوگوں کے اندر تعمیری سوچ اور معتدل مزاج نہ ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اور اگر وہ ترقی کریں گے تو منافق بن کر ترقی کریں گے، یعنی دل میں تو لوگوں کو برا سمجھنا لیکن ظاہری طور پر لوگوں کے ساتھ مفاہمت (adjustment) کر کے اُن سے مادّی فائدہ اٹھانا۔

دہشت گردی بلاشبہہ ایک بھیانک برائی ہے، لیکن دہشت گردی کو گن اور بم کی طاقت سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ دہشت گردی کو ختم کرنے کا مؤثر طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے لوگوں کی منفی سوچ کو بدلنا اور ان کے اندر مثبت سوچ پیدا کرنا۔ جب تک لوگوں کے ذہن کو نہ بدلا جائے، دہشت گردی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ منفی سوچ ہمیشہ شکایتوں کو لے کر پیدا ہوتی ہے۔ لوگ اِن شکایتوں کو کسی گروہ کی ''سازش'' سمجھ کر اُس گروہ کے خلاف ہو جاتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ شکایت، فطرت کے نظام کا حصہ ہے، شکایت کے اسباب کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اِس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ شکایت سے اوپر اٹھ کر سوچا جائے، شکایت کے باوجود لوگوں سے خیر خواہی اور ہمدردی کا تعلق قائم کیا جائے۔

گھیٹو ذہنیت کا نقصان

آج کل کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ تمام مسلمان منفی سوچ (negative thinking) میں جی رہے ہیں۔ مذہبی مسلمان اور سیکولر مسلمان دونوں یکساں طور پر اِس قسم کی سوچ رکھتے ہیں، اُن کے مرد بھی اور ان کی عورتیں بھی۔ کسی مسلمان سے بات کیجیے، کسی مسلمان کے جلسے میں جائیے کسی مسلم ادارے کا معائنہ کیجیے، مسلمانوں کا کوئی اخبار یا میگزین پڑھیے، ہر جگہ آپ کو یہی منفی سوچ کھائی دے گی۔ منفی سوچ ہمیشہ کسی کے خلاف ہوتی ہے، مگر یہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ منفی سوچ کا نقصان خود منفی سوچ والوں کو ہوتا ہے، نہ کہ اُن لوگوں کو جن کے خلاف منفی انداز میں سوچا جارہا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور اِس قانون میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

منفی ذہنیت (negative mentality) کا مطلب ہے، گھیٹو ذہنیت (ghetto mentality)۔ اِس طرزِ فکر کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ دوسروں سے کٹ جاتے ہیں۔ وہ علاحدگی پسندی کے خول میں جینے لگتے ہیں۔ اِس طرح دوسروں کے ساتھ اُن کا انٹریکشن (interaction) ختم ہوجاتا ہے۔ اِس کا بھیانک نتیجہ پس ماندگی اور پچھڑے پن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ صورتِ حال فریقِ ثانی کے لیے بے حد مفید ہے۔ 1947 سے پہلے اِس ملک میں انگریزوں کا اصول یہ تھا کہ لڑاؤ اور حکومت کرو (divide and rule)۔ مسلمان اپنی منفی ذہنیت کی بنا پر آج کی ''غیر قوم'' کو یہ موقع دے رہے ہیں کہ — مسلمانوں کو منفی ذہنیت میں جینے دو، اِس طرح ہمارا دبدبہ ان کے اوپر قائم رہے گا۔

زندگی کا راز علاحدگی پسندی میں نہیں ہے، بلکہ انٹریکشن میں ہے۔ زندگی کا راز لوگوں سے قریب ہونے میں ہے، لوگوں سے دور ہونے میں نہیں ہے۔ زندگی کا راز دوسروں کا خیر خواہ بننے میں ہے، دوسروں سے نفرت کرنے میں نہیں ہے۔ زندگی کا راز مثبت طرزِ فکر میں ہے، منفی طرزِ فکر صرف ہلاکت کا ذریعہ ہے، نہ کہ زندگی کا سرچشمہ۔

سانس کا کاروبار

دہلی میں ہمارے محلے میں ایک صاحب تھے۔ لوگ ان کو ملّا جی کہتے تھے۔ وہ بھینس پالتے تھے اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی دوستی ایک ہندو تاجر سے تھی۔ ان کے یہاں لوہے کا کاروبار تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ملا جی کی ایک بھینس مرگئی۔ وہ اپنے ہندو دوست سے ملے۔ اس سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میری ایک بھینس مرگئی۔ یہ سن کر لوہے کے ہندو تاجر نے کہا کہ ملا جی، تمھارا تو سانس کا کاروبار ہے۔ آیا آیا، نہ آیا' یعنی ایک بھینس صرف اُس وقت تک زندہ ہے جب تک کہ اُس کا سانس چل رہا ہے۔ سانس اگر رک جائے تو بھینس کی زندگی بھی ختم ہوجائے گی۔ مذکورہ تاجر نے یہ بات ملا جی کے کاروبار کے بارے میں کہی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر زندہ انسان کا معاملہ یہی ہے۔ مذکورہ تاجر کو کہنا چاہیے تھا کہ — ملا جی، ہمارا اور تمھارا معاملہ تو سانس کا معاملہ ہے۔ آیا آیا، نہ آیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، انسان کے جسم میں مختلف قسم کے نظام ہیں جو اس کی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر ایک وہ نظام ہے جس کو نظامِ تنفس (respiratory system) کہا جاتا ہے۔ یہ نظام انسانی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ نظامِ تنفس جب تک کام کر رہا ہے، انسان زندہ ہے۔ یہ نظام اپنا کام نہ کرے تو انسان چند منٹ کے اندر مر جائے گا۔

کسی آدمی پر جب موت آتی ہے تو آخر وقت میں اس کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ اِس حالت کو غرغرہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ انسان کا نظامِ تنفس معتدل حالت میں اپنا کام کرنا بند کر دیتا ہے اُس وقت انسان کے گلے سے عجیب قسم کی آواز آنے لگتی ہے۔ چند منٹ تک یہ آواز آتی ہے، اس کے بعد انسان پر وہ حالت طاری ہوجاتی ہے جس کو موت کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کی موت خود اپنی موت کی یاد دہانی ہے۔ ہر موت زندہ لوگوں کو بتاتی ہے کہ جس طرح مرنے والا مر گیا، اُسی طرح زندہ رہنے والا بھی مرے گا۔ ہر موت یاد دلاتی ہے کہ اے لوگو، مستقبل کی تیاری کرو، کیوں کہ آخر کار جو چیز تمھارے حصے میں آنے والی ہے، وہ تمھارا مستقبل ہے، نہ کہ تمھارا ماضی اور حال۔

حقیقی اِشو، غیر حقیقی اِشو

کسی سماج میں جو لکھنے اور بولنے والا طبقہ ہوتا ہے، وہی سماج کا مزاج بناتا ہے۔ موجودہ زمانے میں صحافت اور میڈیا کا رول اِس مزاج سازی میں بہت اہم ہے۔ اِس طبقے کو ایک لفظ میں ذہن ساز طبقہ (opinion-maker class) کہا جاسکتا ہے۔ کسی سماج میں، ذہن ساز طبقے کی ذمے داری بہت زیادہ اہم ہوتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں، ذہن ساز طبقہ عام طور پر ایک خطرناک رول ادا کررہا ہے، وہ یہ کہ یہ طبقہ حقیقی اِشو اور غیر حقیقی اشو میں فرق نہیں کرتا۔ وہ ایسا کرتا ہے کہ غیر حقیقی اشو پر لوگوں کو حساس (sensitive) بنا دیتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ بار بار، غیر حقیقی اشو پر بھڑک اٹھتے ہیں، وہ ایسے معاملات میں ایجی ٹیشن (egitation) اور تشدد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ خود ذہن ساز طبقہ تو اپنے قیادتی منصب کی بنا پر اکثر محفوظ رہتا ہے، لیکن سماج کو اس کا نہایت بھیانک انجام بھگتنا پڑتا ہے۔

حقیقی اشو اور غیر حقیقی اشو کی پہچان کیا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ حقیقی اشو ہمیشہ سنجیدہ غور وفکر کے ذریعہ متعین ہوتا ہے۔ اور غیر حقیقی اشو ہمیشہ وقتی جذبات کے تحت وجود میں آتا ہے۔ اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی اشو کی بنیاد پر سرگرمی ہمیشہ مثبت نتیجے تک پہنچاتی ہے۔ اِس کے برعکس، غیر حقیقی اشو پر جو تحریک چلائی جائے، وہ ہمیشہ مسائل میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

ذہن ساز طبقے کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ لوگوں کو حقیقی اشو کے معاملے میں حساس بنائے، غیر حقیقی اشو کے معاملے میں حساس بنانے کو حرام کے درجے میں وہ اپنے لیے قابلِ پرہیز سمجھے۔ ذہن ساز طبقے کا یہ فرض ہے کہ وہ اِس معاملے میں آخری حد تک محتاط رہے۔

زندگی مختلف قسم کے اشوز (issues) کا جنگل ہے۔ ایسی حالت میں کچھ بولتے ہوئے یا کوئی اقدام کرتے ہوئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کون اشو حقیقی ہے، اور کون اشو غیر حقیقی، جو آدمی اِس فرق کو نہ جانے، اُس پر لازم ہے کہ وہ چپ رہے، نہ کہ نادانی کی بات کرکے مسائل میں اور اضافہ کردے۔

فساد اور اسبابِ فساد

کوئی فساد (riot) جب ہوتا ہے تو وہ اچانک نہیں ہوتا۔ ہر فساد سے پہلے اُس کے اسباب ظاہر ہوتے ہیں جو دھیرے دھیرے فساد بن جاتے ہیں۔ گویا کہ ہر فساد دراصل اسبابِ فساد کا نقطۂ انتہا (culmination) ہوتا ہے۔ اِس لیے فساد کے خلاف اصلاحی کوشش کا آغاز، ظہورِ فساد سے پہلے ہونا چاہیے نہ کہ ظہورِ فساد کے بعد۔ اسلام میں نہی عن المنکر کا مطلب یہی ہے۔ نہی عن المنکر کا حکم اِسی لیے دیا گیا ہے کہ فساد سے پہلے اسبابِ فساد کو روکا جائے، تاکہ فساد کی نوبت نہ آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسبابِ فساد کو ختم کرنے کی کوشش کرنا، اصلاح ہے۔ اور فساد ہو جانے کے بعد متحرک ہونا صرف لیڈری ہے۔ جو لوگ اسبابِ فساد کے ظہور کے وقت خاموش رہیں اور جب عملاً فساد ہو جائے تو وہ جوش وخروش کے ساتھ حرکت میں آجائیں، ایسے لوگ خود بھی فساد انگیزی کے مجرم ہیں۔ اِس قسم کے لوگوں کو اصلاحِ فساد کا کریڈٹ (credit) نہیں مل سکتا۔ اصلاحِ فساد کا کام، فساد سے پہلے شروع ہوتا ہے، نہ کہ عملی طور پر فساد ہو جانے کے بعد۔

اسبابِ فساد کیا ہیں۔ جب کسی سماج میں نفرت کی بولی بولی جائے، جب ایسا ہو کہ کسی گروہ کو ظالم اور دشمن بتا کر اس کے خلاف بُری خبریں پھیلائی جائیں، جب کسی سماج میں ایسے لوگ اس کے لیڈر بن جائیں جو ذاتی ذمے داریوں (duties) کی بات نہ کرتے ہوں، بلکہ وہ حقوق (rights) کو لے کر اپنی محرومی کی داستان سناتے ہوں، جب اپنے لوگوں کی برائیوں پر اُن کو نہ روکا جائے اور دوسروں کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم چلائی جائے، تو سمجھ لیجیے کہ ایسے سماج میں اسبابِ فساد کی آگ بھڑکائی جارہی ہے، جو کسی نہ کسی دن بڑھ کر عملی فساد کی صورت اختیار کرلے گی۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ قوم کے رہ نما خود اپنی قوم کی اصلاح پر ساری توجہ لگائیں، نہ کہ دوسری قوم کے خلاف لوگوں کے اندر منفی جذبات پیدا کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کریں، وہ مفسد ہیں، نہ کہ مُصلح۔ فساد کا علاج اسبابِ فساد کی روک تھام ہے، نہ کہ فساد کے خلاف شکایت اور احتجاج۔

قیامت کا تجربہ

نومبر 1984 میں میرا ایک سفر کیسا بلانکا (مراکو) کے لیے ہوا تھا۔ 25 نومبر 1984 کی شام کو جہاز نے مجھے کیسا بلانکا (Casablanca) کے ائرپورٹ پر اتار دیا۔ اُس وقت میں اکیلا تھا۔ یہاں ایک عجیب تجربہ پیش آیا۔ مجھے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بلایا گیا۔ کانفرنس کی طرف سے مجھے ہوائی جہاز کا ٹکٹ تو بھیج دیا گیا تھا، لیکن کیسا بلانکا میں مقامِ اجتماع کا کوئی پتہ میرے پاس نہ تھا۔ میرے پاس منتظمینِ کانفرنس کا کوئی نمبر بھی نہ تھا جس کے ذریعے میں اُن سے رابطہ قائم کرسکوں۔

میں ائرپورٹ پر اترا تو وہاں کانفرنس کا کوئی آدمی مجھے رسیو (receive) کرنے کے لیے موجود نہ تھا۔ ائرپورٹ کے مختلف لوگوں سے میں نے جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ فرانسیسی زبان بولتے ہیں، وہ نہ عربی زبان سمجھتے تھے اور نہ انگریزی زبان۔ کچھ دیر کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں یہاں ایک بے جگہ شخص (displaced person) بن گیا ہوں۔ یہاں نہ میرا کوئی ساتھی ہے، نہ میرے لیے قیام کی کوئی جگہ ہے، نہ میرے لیے زندگی کے دوسرے سامان۔ محسوس ہوا کہ یہ میرے لیے ایک اجنبی جگہ ہے اور یہاں میں بالکل تنہا ہوگیا ہوں۔

پریشانی کے عالم میں میں اِدھر اُدھر دوڑتا رہا، لیکن کوئی شخص وہاں میری مدد کرنے والا نہیں ملا۔ آخر کار میں اِسی پریشانی کی حالت میں ائرپورٹ کے باہر آگیا۔ یہاں میں ایک اجنبی انسان کی طرح کھڑا ہوا تھا، اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔

کچھ دیر کے بعد مجھے نظر آیا کہ ایک آدمی سڑک کے دوسری طرف سے چل کر میری طرف آرہا ہے۔ وہ میرے پاس آیا اور اردو زبان میں مجھ سے بات کرنے گا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک پاکستانی مسلمان ہیں اور یہاں کسی سروس کے تحت رہتے ہیں۔ اُن کو میرے حالات سن کر مجھ سے ہمدردی ہوئی۔ وہ فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ وہ مجھ کو لے کر ائرپورٹ میں واقع پولیس کے دفتر میں گئے۔ انھوں نے پولس والوں سے فرانسیسی زبان میں بات کی۔ پولس والوں نے کہا کہ اِس بارے میں

ہمارے پاس کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں، البتہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ کیسا بلانکا کے ہوٹل ''سفیر'' میں ایک کانفرنس ہورہی ہے۔ اِس کے بعد مذکورہ پاکستانی مسلمان نے کہا کہ میں صرف یہ کرسکتا ہوں کہ آپ کو اپنی گاڑی میں لے چلوں اور ہوٹل ''سفیر'' کے باہر اتار دوں۔ چناں چہ انھوں نے مجھ کو اپنی گاڑی پر بٹھایا اور ہوٹل سفیر کے گیٹ پر مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

میں ڈرتے ہوئے ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے کانفرنس کے بعض افراد مل گئے جو مجھ کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں میرے لیے ایک کمرہ رِزرو (reserve) ہے۔ اِس کے بعد انھوں نے مجھ کو ہوٹل کا کارڈ دے کر اس کے کمرہ نمبر 1207 میں پہنچا دیا۔

25 نومبر 1984 کو جو مذکورہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا، وہ میرے لیے قیامت کا ایک محدود تجربہ تھا۔ آدمی پیدا ہونے کے بعد اپنے ماں باپ اور اپنے رشتے داروں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے، جہاں اس کو فطرت کی طرف سے ایک مکمل قسم کا لائف سپورٹ سسٹم (life support system) ملا ہوا ہے۔ آدمی اپنا ایک گھر بناتا ہے اور اپنے لیے تمام ضروری ساز وسامان کی ایک دنیا تعمیر کرتا ہے۔

ہر آدمی اپنی بنائی ہوئی دنیا میں آزادی کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ اچانک ایک سنگین واقعہ پیش آتا ہے۔ یہ موت کا واقعہ ہے۔ موت آدمی کو اس کی بنائی ہوئی دنیا سے مکمل طور پر جدا کر کے ایک اور دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہاں وہ اُن چیزوں سے محروم ہوجاتا ہے، جن کے درمیان وہ اپنی تمام ضروریات پوری کرتے ہوئے زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے دوست اور رشتے دار بھی اُس سے مکمل طور پر جدا ہوجاتے ہیں۔ اِس دوسری دنیا میں آدمی تنہا بھی ہوتا ہے اور پوری طرح بے سروسامان بھی۔

25 نومبر 1984 کو میرے ساتھ جو تجربہ گزرا، وہ میرے لیے اِسی قسم کا ایک محدود تجربہ تھا۔ یہ موت کے بعد آنے والی دنیا کی ایک جُزئی تصویر تھی۔ اگلی دنیا کی اِس قسم کی جزئی تصویر کبھی نہ کبھی ہر انسان کو دکھائی جاتی ہے، تاکہ وہ موت کے بعد سامنے آنے والے حالات کا پیشگی تعارف حاصل کرلے اور اس کے لیے ضروری تیاری کرسکے۔

کامیاب زندگی کا سفر

تمام مقبول ناول وہی ہیں جو ٹریجڈی کے طور پر لکھے گئے۔ اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اِس دنیا میں ہر آدمی مایوسی کے احساس میں جیتا ہے، اِس لیے ٹریجک ناول اس کے مائنڈ کو زیادہ ایڈریس کرتے ہیں۔ اِس کے مقابلے میں، کامیڈی اس کے مائنڈ کو ایڈریس نہیں کرتی۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے آئڈیل کو چاہتا ہے، لیکن ساری کوشش کے باوجود اس کو دنیا میں صرف آئڈیل سے کم (less than ideal) حاصل ہوتا ہے۔ یہ محرومی اتنی زیادہ عام ہے کہ اِس میں کسی عورت، یا مرد کا کوئی استثنا نہیں۔

یہ بلاشبہہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اِس مسئلے کا حل صرف اُس وقت معلوم ہوتا ہے، جب کہ اس کو خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اِس کے سوا، کوئی بھی طریقہ اِس معاملے کی توجیہہ نہیں کرتا۔

اصل یہ ہے کہ خدا نے ہر انسان کو معیار پسند (idealist) ہستی کے طور پر پیدا کیا ہے۔ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک متلاشیٔ معیار حیوان (ideal-seeking animal) ہے۔ لیکن یہ معیار (ideal) موجودہ دنیا میں سرے سے قابلِ حصول نہیں۔ وہ صرف آخرت میں، جنت کی صورت میں کسی انسان کو مل سکتا ہے۔

خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) کے مطابق، موجودہ دنیا آزمائش (test) کی دنیا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو صرف اِس لیے رکھا گیا ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو جنت کے لیے تیار کرے۔ موجودہ دنیا کے حالات میں جو لوگ اپنے عمل سے اِس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسانے کے قابل ہیں، وہ موت کے بعد اس میں بسائے جائیں گے، اور بقیہ لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر دیا جائے گا۔

طلب اور مطلوب میں یہی تضاد ہے جو لوگوں کے اندر محرومی کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے۔

انسان اپنے پیدائشی مزاج کے مطابق، اپنے لیے ایک کامل دنیا چاہتا ہے، ایک ایسی دنیا جہاں ہر چیز پرفکٹ اور آئڈیل ہو۔ لیکن ساری کوشش کے باوجود اُس کو یہاں صرف ایک غیر کامل دنیا (imperfect world) ملتی ہے، ایک ایسی دنیا جہاں ہر چیز غیر کامل اور غیر معیاری ہے۔

اِس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ انسان، خدا کے تخلیقی پلان کو سمجھے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ وہ موجودہ دنیا کو تیاری کی دنیا (preparatory world) سمجھے، نہ کہ اپنے مطلوب کو پانے کی دنیا۔ جو انسان، خدا کے اِس تخلیقی پلان کو جانے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کا نقشہ بنائے، وہ بہ یک وقت اپنے لیے دو رحمتوں کو حاصل کرے گا—ایک یہ کہ دنیا کی زندگی میں وہ ٹنشن اور مایوسی کا شکار نہ ہوگا۔ اور دوسرے، یہ کہ موت کے بعد جب وہ اگلی دنیا (world hereafter) میں پہنچے گا، تو وہاں وہ جنت کو پالے گا، یعنی ابدیت (eternity) کی دنیا۔

ہر انسان ایک کامل زندگی کی تلاش میں ہے۔ لیکن ہر انسان اُس سے محروم ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی مطلوب منزل کو قبل از موت کی دنیا میں تلاش کر رہا ہے، جب کہ خالق کے تخلیقی پلان کے مطابق، وہ موت کے بعد کی دنیا میں رکھ دی گئی ہے۔ یہی وہ دریافت (discovery) ہے جس سے کامیاب زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔

خدا کے تخلیقی پلان کو نظر انداز کرنے سے، انسان کی زندگی المیہ (tragedy) بن جاتی ہے۔ اگر خدا کے تخلیقی پلان کو اپنا رہ نما نہ بنایا جائے تو انسان کی زندگی ایک طربیہ (comedy) بن جائے گی۔

دعوتی مقصد کے لیے ماہ نامہ الرسالہ اور مولانا وحید الدین خاں کی
کتابیں مفت حاصل کریں:

Peace Hall
38 Ayodhyapuram
Dehradun Road, Saharanpur
Mob. 09997153735

موت کا تصور

موت (death) کے لفظ کو اگر آپ ڈکشنری میں دیکھیں تو اس میں موت کا مطلب یہ لکھا ہوا ہوگا کہ — زندگی کا ابدی خاتمہ:

Permanent cessation of life

موت کی یہ لغوی تعریف، موت کی منفی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ آدمی مکمل انسان کی حیثیت سے پیدا ہو، لیکن تھوڑی مدت تک زندہ رہ کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہوجائے۔ اس کی تمام آرزوئیں (desires) اور اس کی تمام صلاحتیں اِس طرح مٹ جائیں کہ دوبارہ اُن کا وجود میں آنا ممکن نہ رہے۔

اسلام اِس کے مقابلے میں، زندگی کا مثبت تصور پیش کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق، موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت کا مطلب انسان کے لیے اس کے دوسرے دورِ حیات کا آغاز ہے:

Death is not the end of life. Death marks the beginning of the second phase of human life.

اسلام کے مطابق، انسان کو ابدی مخلوق (eternal being) کے طور پر پیدا کیا گیا، پھر اس کے عرصۂ حیات (life span) کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا — قبل از موت حصہ، اور بعد از موت حصہ۔ قبل از موت عرصۂ حیات تیاری کی جگہ ہے اور بعد از موت عرصۂ حیات تیاری کے مطابق، اپنا مستقل انجام پانے کی جگہ۔

اِس تخلیقی پلان کے مطابق، آدمی کو چاہیے کہ وہ موت سے پہلے کی زندگی کو تیاری کا دور (preparatory period) سمجھے اور اس کو کامل طور پر تیاری میں گزارے۔ کیوں کہ موت کے بعد زندگی کا جو دور آدمی کے سامنے آئے گا، اُس میں عمل کرنا نہ ہوگا، بلکہ کیے ہوئے عمل کا انجام پانا ہوگا۔

موت کا واقعہ دراصل، زندگی کا پیغام ہے۔ موت کا پیغام یہ ہے کہ — جو کرنا ہے، اُس کو آج کے دن کرلو۔ کیوں کہ کل کے دن کرنے کا وقت باقی نہیں رہے گا۔

ناقص علم کا مسئلہ

قدیم زمانے میں یونان کے بعض سیّاح جب اپنے سفر سے واپس آئے، تو انھوں نے لوگوں کو ایک پُر عجوبہ (wondrous) کہانی بتائی۔ اِس کا مقصد صرف تفنّن (humour) تھا۔ انھوں نے کہا کہ سیاحت کے دوران ہم ایک جزیرے میں پہنچے، اِس جزیرے میں ہم نے ایک عجیب مخلوق دیکھی۔ اِس مخلوق کا جسم تو بالکل گھوڑے جیسا تھا، لیکن اس کا سر انسان کے سر کی مانند تھا، یعنی وہ مخلوق اپنے جسم کے اعتبار سے گھوڑا اور اپنے سر کے اعتبار سے انسان تھی۔

لوگوں نے جب سیاحوں کی زبان سے اِس قصے کو سنا، تو انھوں نے اِس پر یقین کرلیا۔ کہانی لکھنے والوں نے اِس پُر عجوبہ مخلوق کا ذکر اپنی کہانیوں میں کیا۔ اِس طرح نسل در نسل اُس کا چرچا ہوتا رہا، یہاں تک لوگ اِس بے اصل کہانی کو ایک حقیقی واقعہ سمجھنے لگے۔

موجودہ زمانے میں ہر چیز کا سائنٹفک مطالعہ کیا گیا ہے۔ اہلِ علم نے اِس قصے کا بھی سائنٹفک تجزیہ کیا، پھر انھوں نے بتایا کہ ایسا ہونا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی ذی حیات مخلوق کو ہمیشہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِسی اعتبار سے نیچر نے ہر ایک کے نتھنے بنائے ہیں۔ انسان کا نتھنا (nostril) چھوٹا ہے اور گھوڑے کا نتھنا بڑا۔ اب اگر گھوڑے کے جسم کے ساتھ انسان کا سر جوڑ دیا جائے، تو گھوڑے کو کم آکسیجن ملے گی۔ آکسیجن کی کمی کے سبب سے وہ جلد ہی مر جائے گا:

> Human nostrils could not pass enough air to fill a horse's lungs. consquently, this kind of horse will die. A head like a man's could not exist in relation to any type of body differing from a man's.

لوگ عام طور پر عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ چناں چہ آج بھی بہت سے لوگ ہیں جو اِس قسم کی فرضی کہانیوں کو واقعہ سمجھے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے اِس مزاج کی یہ بھاری قیمت دینی پڑتی ہے کہ ان کا ذہنی ارتقا (intellectual development) رک جاتا ہے۔ وہ اپنی عجوبہ پسندی کی بنا پر حقیقت پسندانہ روش اختیار کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

زندگی کا خاتمہ

26 ستمبر 2008 کو نئی دہلی کے پارلیامنٹ انکسی میں ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اِس پروگرام کو نئی دہلی کے ایف اے این ایس (Foundation for Amity & National Solidarity) نے آرگنائز کیا تھا۔ اس کے صدر لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر سوم ناتھ چٹرجی تھے۔ اِس موقع پر مشہور جنرلسٹ خشونت سنگھ (پیدائش: 1915) کو نیشنل ایمٹی ایوارڈ دیا گیا۔ اسٹیج سے مسٹر خشونت سنگھ کے تعارف میں جو تقریر ہوئی، اُس میں بتایا گیا کہ زندگی کے بارے میں مسٹر خشونت سنگھ کا نظریہ یہ ہے کہ:

Enjoy good things in life.

مگر خود مسٹر خشونت سنگھ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اِس نظریے کی زندہ تردید بنے ہوئے تھے۔ تقریباً 95 سال کی عمر کو پہنچ کر وہ بہت کم زور ہو چکے تھے، وہ جھک کر چلتے تھے، ان کے اوپر مایوسی چھائی ہوئی تھی، چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے سوچا کہ انسان، دنیا میں انجوائے کرنے کا نظریہ بناتا ہے، حالاں کہ اس کے لیے مقدر ہے کہ وہ بہت جلد انجوائے کرنے کے قابل ہی نہ رہے:

Enjoy good things in life only to become
so weak that you are unable to enjoy anything.

یہ صرف ایک شخص کی کہانی نہیں، یہی پوری تاریخ کی کہانی ہے۔ ہر زمانے میں انسان کا یہی حال ہوا ہے کہ وہ اپنے لیے خوشیوں کا ایک محل بنانا چاہتا ہے، لیکن آخر میں بڑھاپا آتا ہے اور اس کے سارے منصوبے کو ناکام کر دیتا ہے۔

یہاں انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کرے۔ لیکن انسان اپنی سوچ پر نظر ثانی نہیں کر پاتا، یہاں تک کہ مایوسی کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، حالاں کہ اگر وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کرے تو عین ممکن ہے کہ اس کی زندگی ٹریجڈی (المیہ) کے بجائے، کامیڈی (طربیہ) میں بدل جائے۔ اس کا خاتمہ امید پر ہو، نہ کہ ناامیدی پر۔

ہر شخص موت کا مسافر

ایک خبر میڈیا میں آئی ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (9 اکتوبر 2008) میں یہ خبر حسب ذیل الفاظ میں چھپی ہے:

British reality TV star Jade Goody, who has been diagnosed with cancer, says she has started planning for her funeral, adding she wants "people to cry over me". "Most people plan their weddings. But I am planning my funeral", Goody told OK! Magazine. Goody was diagnosed with cervical cancer in August 2008 just as she prepared to appear in the Indian version of the British reality TV show celebrity Big Brother. (p. 21)

برطانی ٹی وی اسٹار جیڈ گوڈی اپنے پروفیشن کے اعتبار سے چوٹی (peak) پر تھیں۔ اچانک اگست 2008 کے طبی معائنے میں اُن کو بتایا گیا کہ اُن کو کینسر کی بیماری ہو چکی ہے، یعنی لاعلاج بیماری۔ انھوں نے اپنے مستقبل کے پروفیشنل منصوبوں کو منسوخ کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب مجھے موت کی تیاری کرنی ہے۔ لوگ شادی کا منصوبہ بناتے ہیں، مجھ کو اپنی موت کا منصوبہ بنانا ہے:

Most people plan their weddings. But I am planning my funeral.

یہی ہر عورت اور ہر مرد کی کہانی ہے۔ لوگ زندگی کا جشن منانے کے لیے سرگرم رہتے ہیں، حالاں کہ ہر ایک کا آخری انجام یہ ہے کہ جشن کی تکمیل سے پہلے اُس پر موت آئے اور وہ موجودہ دنیا سے نکل کر اگلی دنیا میں پہنچ جائے۔ ایسی حالت میں ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ قبل از موت مرحلۂ حیات کو صرف ایک وقتی سفر سمجھے اور اپنی ساری توجہ بعد از موت مرحلۂ حیات کی تیاری میں لگا دے۔

لوگ اپنا برتھ ڈے مانتے ہیں۔ حالاں کہ ہر سال گرہ صرف اِس بات کا اعلان ہے کہ آدمی کی عمر کا ایک سال اور کم ہو گیا۔ ایسی حالت میں، ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ ہر سال کی تکمیل پر آنے والی موت کو یاد کرے۔ کیوں کہ اگلی سال گرہ کا آنا یقینی نہیں، لیکن موت کا آنا یقینی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اِس سب سے بڑی حقیقت کو یاد رکھے جس کا دوسرا نام موت ہے۔

مواقع کا استعمال

مواقع (opportunities) کے استعمال کی دوصورتیں ہیں— ایک ہے اُن کا دانش مندانہ استعمال، اور دوسرا ہے اُن کا غیر دانش مندانہ استعمال۔ مواقع کا دانش مندانہ استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مواقع آدمی کے لیے ترقی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اِس کے برعکس، مواقع کا غیر دانش مندانہ استعمال ہمیشہ بربادی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک مثال آزادی (freedom) ہے۔ موجودہ زمانے میں آزادی کی صورت میں ہر ایک کو عظیم مواقع کار حاصل ہوئے ہیں۔ مثلاً پریس کی آزادی، جلسہ جلوس کی آزادی، وغیرہ۔ لوگوں نے اِن مواقع کا بڑے پیمانے پر استعمال بھی کیا ہے، لیکن یہ استعمال ہر جگہ صرف نقصان میں اضافے کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ اِن مواقع کا جو تعمیری فائدہ ہے، وہ اب تک حاصل نہ کیا جاسکا۔

مثلاً پریس کو اب تک شکایت اور احتجاج (protest) کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اُس کو تعمیرِ خویش کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام لوگ منفی سوچ کا شکار ہوگئے۔ موجودہ زمانے میں مثبت سوچ موجود نہیں۔ اِس کا سب سے بڑا سبب پریس کا یہی احتجاجی استعمال ہے۔

مواقع کا مثبت استعمال صرف وہ لوگ کر پاتے ہیں جو مواقع کے کم تر استعمال پر راضی ہوجائیں، یعنی مواقع جتنا زیادہ آگے بڑھنے کی اجازت دے رہے ہیں، اُس کے مقابلے میں پیچھے رہ کر اپنا کام کرنا۔ مواقع اگر آپ کو ہائی پروفائل (high profile) میں بولنے کی اجازت دے رہے ہیں تو آپ لو پروفائل (low profile) میں بولنے کی اجازت دے رہے ہیں تو آپ لو پروفائل (low profile) میں بولنے پر اپنے آپ کو راضی کرلیں۔ مواقع اگر آپ کو دھوم مچا کر کام کرنے کی اجازت دے رہے ہیں تو آپ خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دیں۔ مواقع اگر آپ کو غَوغائی سیاست کی اجازت دے رہے ہوں تو آپ چپ کی سیاست اختیار کرلیں۔ یہی اِس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

کاش ایسا ہوتا، کاش ویسا نہ ہوتا

ہیرنشا ایک برٹش رائٹر ہے۔ اُس نے اپنی ایک کتاب میں بہت سی واقعاتی مثالوں کے ذریعے بتایا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ کچھ اور ہوتی، اس کتاب کا نام یہ ہے— تاریخ کے اگر:

The Ifs of History, by F. G. C. Hearenshaw

یہ عام انسانی کم زوری ہے کہ وہ گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں جیتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتا رہتا ہے کہ— کاش ایسا ہوتا، کاش ویسا نہ ہوتا۔ اِس قسم کی سوچ ایک تباہ کن سوچ ہے۔ وہ آدمی کے اندر غیر ضروری قسم کا ٹنشن پیدا کر دیتی ہے۔ ٹنشن ایک سخت قسم کی مہلک چیز ہے۔ ٹنشن اگرچہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے، لیکن ٹنشن آدمی کے اندر طرح طرح کی مہلک بیماریاں پیدا کر دیتا ہے۔

ماضی کی تلخ یادوں میں جینا، ایک ایسی عادت ہے جس کا نقصان یقینی ہے، اور اس کا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ ماضی کی غلطیوں کو یاد کر کے اگر ان سے سبق لیا جائے تو بلاشبہہ وہ انسان کے لیے مفید ہیں۔ لیکن اگر ماضی کی غلطیوں کو سوچ کر آدمی غم اور افسوس میں پڑا رہے تو یہ ایک سخت ناعاقبت اندیشانہ فعل ہے۔ کیوں کہ ماضی کی تاریخ کبھی کسی کے لیے واپس نہیں آتی۔ ماضی کی تلخ یادوں کو صرف بھلانا ہے، نہ کہ ان کو یاد کر کے اپنے ذہن میں ان کی تلخی باقی رکھنا۔

گزرا ہوا وقت کبھی کسی کے لیے واپس نہیں آتا۔ عقل مند انسان وہ ہے جو حاصل شدہ مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کرے، نہ کہ گزرے ہوئے مواقع کو یاد کر کے اس پر افسوس کرتا رہے۔ اِسی حقیقت کو ایک اردو شاعر نے اِس طرح بیان کیا ہے:

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

زندگی ناموافق حالات میں موافقت تلاش کرنے کا نام ہے، نہ کہ ناموافق حالات پیش آنے پر اُس کے خلاف غم اور افسوس کرنے کا۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچائے اور ہمیشہ مثبت طرزِ فکر پر قائم رہے۔

نگیٹو ایڈوانٹج لینا

ہر ایڈوانٹج (advantage) کے دو پہلو ہوتے ہیں—مثبت پہلو اور منفی پہلو۔ جب کسی ایڈوانٹج کا مثبت استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کو خود بھی اس کا فائدہ پہنچے گا اور وہ سماج کو بھی فائدہ پہنچانے کا سبب بن جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایڈوانٹج کا منفی استعمال کیا جائے تو اس کا الٹا نتیجہ نکلے گا۔ ایسا آدمی خود بھی نقصان اٹھائے گا اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچانے کا سبب بنے گا۔

اِس کی ایک مثال آزادی ہے۔ آزادی بلاشبہہ ایک اعلیٰ نوعیت کا ایڈوانٹج ہے۔ لیکن آزادی کے استعمال کے دو پہلو ہیں—مثبت استعمال اور منفی استعمال۔ آزادی کا مثبت استعمال اس کا صحیح استعمال ہے، اور آزادی کا منفی استعمال اس کا غلط استعمال۔ دونوں قسم کے استعمال کے نتائج کبھی یکساں نہیں ہوسکتے۔

اگر آپ آزادی کا اِس طرح استعمال کریں کہ قانونی حدود میں رہتے ہوئے بزنس کریں، محنت کرکے تعلیم حاصل کریں، تعمیری مقصد کے تحت آرگنائزیشن بنائیں، اِس طرح کا ہر کام آزادی کا مثبت استعمال ہے۔ آزادی کا ایسا استعمال ہمیشہ مفید ثابت ہوتا ہے، فرد کے لیے بھی اور اجتماع کے لیے بھی۔ لیکن آزادی کا اگر منفی استعمال کیا جائے تو وہ فرد اور اجتماع دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ مثلاً جذباتی سیاست چلانا، اینٹی اسٹیبلش مینٹ (anti-establishment) نعروں پر لوگوں کو بھڑکانا، لوگوں کو ڈیوٹی کانشش (duty-conscious) بنانا نے کے بجائے رائٹ کانشش (right-conscious) بنانا، اپنی کوتاہی کا الزام دوسروں کے اوپر ڈال کر مخالفانہ تحریک چلانا، وغیرہ۔

یہ آزادی کا نگیٹو ایڈوانٹج لینا ہے۔ اِس قسم کی پالیسی ہمیشہ اور ہر اعتبار سے تباہ کن ثابت ہوتی ہے، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ کسی چیز کا نگیٹو ایڈوانٹیج لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مواقع کے استعمال اور مواقع کی بربادی کے فرق کو نہیں سمجھتا۔ وہ نہیں جانتا کہ کوئی ایڈوانٹج اِس لیے ہوتا ہے کہ اس کا مثبت استعمال کرکے اس سے فائدہ اٹھایا جائے، نہ کہ اس کا نگیٹو استعمال کرکے اپنی تباہی میں اضافہ کرلیا جائے۔

ایم فیکٹر، کیو فیکٹر

دہلی کے ایک مسلم نوجوان ایک انگریزی میگزین میں کام کرتے تھے۔ اِس میگزین کے مالکان سب ہندو تھے۔ چند سال کے بعد منتظمین کی طرف سے مذکورہ مسلم نوجوان سے کہا گیا کہ آپ استعفیٰ دے دیں۔ چوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ استعفیٰ نہ دیں تو اُن کو برخاست کر دیا جائے گا۔ اِس لیے انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

اِس کے بعد مذکورہ مسلم نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میرے ساتھی کہتے ہیں کہ اِس کا سبب ایم فیکٹر (M-factor) ہے۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں، اِس کا سبب صرف کیو فیکٹر (Q-factor) ہے، یعنی مسلم فیکٹر نہیں، بلکہ کوالٹی فیکٹر۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے دل سے منفی خیال مکمل طور پر نکال دیں اور آپ صرف ایک کام کریں، وہ ہے اپنی انگلش رائٹنگ کو امپرو (improve) کرنا۔ میرے مشورے سے انھوں نے برٹش کاؤنسل میں داخلہ لے لیا۔ وہاں انھوں نے ایک سال اپنی زبان کو امپرو کرنے کی کوشش کی۔ برٹش کاؤنسل سے ایک سال کا کورس پورا کرنے کے بعد ان کی زبان پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ اِس کے بعد انھوں نے ایک اور انگریزی میگزین میں انٹرویو دیا۔ وہاں ان کا سلیکشن ہو گیا۔ اب وہ اِس دوسرے انگریزی میگزین میں کام کر رہے ہیں۔ یہاں ان کو پہلے سے تقریباً تین گنا زیادہ تنخواہ ملتی ہے، جب کہ اِس دوسرے میگزین کے مالکان بھی ہندو ہیں۔

اِس مثال سے زندگی کی ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب وہ کسی ناپسندیدہ صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ یہ کرتے ہیں کہ اس کو فوراً تعصب (bias) کا معاملہ سمجھ کر اس کی ذمے داری دوسرے کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ تعصب کا لفظ صرف ڈکشنری میں پایا جاتا ہے، حقیقی زندگی میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

جب بھی آپ کو دوسروں کی طرف سے کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے تو سمجھ لیجیے کہ وہ خود آپ کی کسی کمی کی بنا پر پیش آیا ہے۔ اپنی کمی کو دریافت کر کے اس کو دور کیجیے اور پھر آپ کی شکایت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

سوال و جواب

سوال

جب ہم قرآن کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا بیش تر حصہ ہمارے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کے بیش تر حصے کے مخاطب دوسرے لوگ ہیں، یعنی غیر مسلم اقوام۔ قرآن کہیں منکر کو خطاب کرتا ہے، کہیں اہلِ کتاب یہودی اور مسیحی لوگوں کو خطاب کرتا ہے، کہیں منافق کو خطاب کرتا ہے اور کہیں منکرینِ پیغمبر کو خطاب کرتا ہے۔ ایسی حالت میں ایک مسلمان قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ ہم قرآن کے صرف جزئی مخاطب ہیں۔ براہِ کرم، اِس معاملے کی وضاحت کیجیے (ایک قاری الرسالہ، حیدرآباد)۔

جواب

یہ سوال ایک مغالطے پر مبنی ہے۔ وہ مغالطہ یہ ہے کہ — ہم مسلمان مذکورہ کردار سے پاک ہیں۔ حالاں کہ اگر محاسبہ (introspection) کا مزاج ہو تو قرآن کا مسلمان قاری ہر خطاب کو خود اپنے لیے محسوس کرے گا۔ کیوں کہ منکر، یا منافق، یا یہودی، یا مسیحی، یہ سب گروہی نام نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کسی صفت سے متصف لوگوں کے نام ہیں۔ اگر حقیقی محاسبہ موجود ہو تو قاری محسوس کرے گا کہ یہ سب صفات تو خود میرے اندر بھی موجود ہیں، جیسا کہ اصحابِ رسول کا حال تھا۔

چناں چہ ایک تابعی (حسن بصری) نے کہا کہ میں 70 صحابہ سے ملا۔ ہر ایک کو یہ احساس تھا کہ میں نفاق میں مبتلا ہو گیا۔ اِسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان بعد کے زمانے میں، یہود و نصاریٰ کے طریقے اختیار کر لیں گے (لتتبعنّ سنن من کان قبلکم ، شبراً بشبرٍ و ذراعاً بذراعٍ)، ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ آپس کی لڑائی کر کے تم کافر نہ بن جانا (لاترجعوا بَعدی کُفّاراً، یضرب بعضکم رقاب بعض)، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر قاری کے اندر صحیح مزاج موجود ہو تو قرآن میں مذکور ہر کردار اُس کے لیے ایک آئینہ بن جائے گا جس میں آدمی کو خود اپنی تصویر دکھائی دے گی۔

مسلمان کسی نسلی گروہ کا نام نہیں ہے۔ مسلمان کی شخصیت، گروہ سے تعلق کی بنا پر نہیں، بلکہ

انفرادی کردار کی بنا پر بنتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، اِس دنیا میں آدمی امتحان کی حالت میں ہے۔ مسلمان بھی اسی امتحان میں ہیں۔ اِس بنا پر ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ وہ نفس یا شیطان کی ترغیبات کی بنا پر کسی گم راہی میں مبتلا ہو جائیں۔ یہ اندیشہ ہر مسلمان کے لیے موجود رہتا ہے۔ اِسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ ہر وقت اپنا محاسبہ کرتے رہو۔ اگر آدمی کے اندر محاسبہ کی زندہ کیفیت موجود ہو تو وہ بار بار محسوس کرے گا کہ وہ اُس چیز کا شکار ہو رہا ہے، جس کو قرآن میں مسِّ شیطان (الأعراف: 201) کہا گیا ہے۔ اِس طرح بار بار ایسا ہوگا کہ ایک مسلمان اقرار کے اعتبار سے، مسلمان ہوتے ہوئے مختلف قسم کی خفیہ یا علانیہ گم راہی کا شکار ہو جائے۔ یہ مزاج اگر مسلمان کے اندر زندہ ہو تو پورا قرآن اس کے لیے ہدایت کی کتاب بن جائے گا۔ دوسروں سے خطاب میں وہ محسوس کرے گا کہ یہاں قرآن خود مجھ کو اپنا مخاطب بنا رہا ہے۔

سوال

اپنی استطاعت کے مطابق، میں Dawah work کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک شخص نے مجھ سے religion، civilization، culture اور tradition کے بارے میں کئی سوالات کیے۔ تمام سوالات کو غور سے سننے کے بعد میں نے اُن صاحب سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ان باتوں کا مجھے بخوبی علم نہیں ہے۔ اُن صاحب کے مطابق، ایک مذہب لیکن دو تہذیبیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ اُس کی مثال اُنھوں نے دو الگ تہذیبیں رکھنے والے، بنگلہ دیش اور موجودہ پاکستان کے مسلمانوں سے دی۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہولی کے تیوہار کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک culture اور tradition ہے۔ اِسے آپ لوگوں کے منانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اِسی طرح عورتوں کا اپنے ماتھے پر بندیا لگانے کو مذہب سے نہیں بلکہ tradition سے جوڑنا چاہیے۔ اُن کا کہنا تھا کہ آپ مذہب اور culture کو الگ کر کے دیکھیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ اِن سوالات کی وضاحت فرمائیں۔
(منصور سردار، بھیونڈی، مہاراشٹر)

جواب

مذکورہ سوالات سب کے سب، غیر علمی سوالات ہیں۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش اور پاکستان میں

علاحدگی دو تہذیبوں کی بنا پر نہیں ہوئی، بلکہ یہ علاحدگی دو سیاسی مفاد (political interest) کی بنا پر ہوئی۔ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی پورے پاکستان پر حکومت کرنا چاہتی تھی، اور پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی پورے پاکستان پر حکومت کرنا چاہتی تھی۔ دونوں میں سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ اِس لیے دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہوا، اور اِس ٹکراؤ کے نتیجے میں دو الگ الگ ملک بن گئے۔

ہولی کا تہوار، یا ماتھے پر عورتوں کا بندیا لگانا، بلاشبہہ کلچرل چیزیں ہیں۔ لیکن یہ کلچر ہندو روایات (traditions) کے تحت بنا ہے۔ اِس طرح کی روایات ہر ملک میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جس گروہ میں یہ روایتیں پائی جاتی ہیں، اُسی گروہ کے لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ اِس طرح کی روایتوں کو ہر گروہ کے اوپر چسپاں کیا جائے۔

دو چیزیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں— کمیونٹی کلچر، اور نیشنل کلچر۔ نیشنل کلچر صرف وہ ہے جو کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا سے ثابت ہوتا ہو۔ جو چیز کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا سے ثابت نہ ہوتی ہو، وہ کمیونٹی کلچر کا حصہ قرار پائے گی، نہ کہ نیشنل کلچر کا حصہ۔ کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا کے مطابق، ہر کمیونٹی کو اپنے کلچر پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔ لیکن کسی کمیونٹی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی خود ساختہ توجیہہ کی بنا پر، اپنے کلچر کو دوسرے گروہ کے اوپر چسپاں کرنے لگے۔

آپ دعوت الی اللہ کا کام کر رہے ہیں، تو آپ کو جاننا چاہیے کہ دعوت کا ایک لازمی اصول اعراض (avoidance) ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ ایسی باتوں سے مکمل اعراض کریں جو دعوتی عمل سے براہِ راست تعلق نہ رکھتی ہوں۔ اصولِ اعراض کی کامل پیروی کے بغیر کوئی شخص دعوت الی اللہ کا کام نہیں کرسکتا۔

1 - واشنگٹن (امریکا) کے ادارہ ہنری ایل اسٹمسن سنٹر (Henry L. Stimson Centre) کے اسپانسرشپ کے تحت، انڈیا کے مختلف شہروں میں سیمنار منعقد کیا گیا۔ دہلی میں اِس سیمنار کا انتظام حسب ذیل دواداروں کے ذریعے کیا گیا:

1. Dr. K. R. Narayan Centre for Dalit and Minorities Studies, Jamia Millia Islamia (New Delhi)
2. Centre for Study of Society and Secularism (Bombay)

نئی دہلی میں یہ سیمنار 17 ستمبر 2008 کی شام کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ''میر تقی میر ہال'' میں کیا گیا۔ اس کے آرگنائز ڈکٹر امت پانڈیا (Dr. Amit Pandya) تھے۔ اِس سیمنار کا موضوع یہ تھا:

Various Issues Facing Indian Muslims,
Their Worldview and Vision for the Future.

اِس سیمنار میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ اِس سیمنار کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر ایک تقریر کی۔ اُن کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کی نشان دہی کر کے ان کو استعمال کیا جائے۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی ٹیم کے افراد سیمنار میں موجود تھے۔ انھوں نے حاضرین کے درمیان اسلامی لٹریچر تقسیم کیا۔ سی پی ایس کے ممبران نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا۔ یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں تھا۔

2- سائی انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں 17 ستمبر 2008 کو ایک پروگرام ہوا۔ اِس پروگرام کا موضوع یہ تھا:

Basic Human Values in Islam

اِس پروگرام میں کیندریہ ودیالیہ کے پرنسپل حضرات شریک تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت اور قرآن وحدیث کی روشنی میں موضوع ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ یہاں حاضرین کے درمیان اسلامی لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا۔ لوگوں نے اس کو بہت شوق سے لیا۔

3- نئی دہلی کی تنظیم انٹرفیتھ کوآپریشن فار پیس (ICP) کی طرف سے 23 ستمبر 2008 کو انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر (لودھی روڈ، نئی دہلی) میں انٹرفیتھ پریئر میٹنگ (Interfaith Prayer Meeting) کے موضوع پر ایک سیمنار ہوا۔ اِس کا مقصد ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد کے واقعات کے پس منظر میں مختلف مذاہب کی تعلیمات کو بتانا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اِس موقع پر سی پی ایس ٹیم کے ممبران نے حاضرین کے درمیان اسلامی لٹریچر تقسیم کیا۔

4- سہارا سمے ٹی وی (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو میں ''ماہِ رمضان'' کے پروگرام کے تحت، رمضان اور شانتی کے

موضوع پر 25 ستمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کے دوران صدر اسلامی مرکز نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں امن کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

5- 26 ستمبر 2008 کو ایف اے این ایس (Foundation for Amity & National Solidarity) کے تحت، پارلیامینٹ ہاؤس انیکسی میں ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام مشہور جنرلسٹ خشونت کو نیشنل امٹی ایوارڈز دینے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز کے ساتھ سی پی ایس انٹرنیشنل کی ٹیم نے اس پروگرام میں شرکت کی۔ اِس موقع پر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد موجود تھے۔ ٹیم کے لوگوں نے ان کے درمیان اسلامی لٹریچر تقسیم کیا۔ لوگوں نے اس کو بہت شوق سے لیا۔ جن لوگوں کو لٹریچر نہیں مل سکا تھا، انھوں نے پروگرام کے بعد ٹیم کے لوگوں سے اپنے شوق کا اظہار کیا اور اُن سے اسلامی لٹریچر حاصل کیا۔

6- نئی دہلی کے سام ٹی وی (SAM TV) نے 27 ستمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا کہ آج کل بم دھماکے میں اعظم گڑھ (یوپی) کا نام کیوں آرہا ہے، جب کہ پہلے ایسا نہ تھا۔ جواب میں بتایا گیا کہ یہ اعظم گڑھ کی بات نہیں ہے، بلکہ میڈیا کی بات ہے۔ پہلے موجودہ میڈیا نہیں تھا۔ اُس وقت اعظم گڑھ جیسے علاقوں میں خبریں نہیں پہنچتی تھیں۔ اب ہر جگہ خبریں پہنچ رہی ہیں اور ہر جگہ ان کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ اِس بنا پر ایسے واقعات ہوتے ہیں۔

7- نئی دہلی کے ٹو نٹی فور ٹی وی (24 News) کی ٹیم نے 28 ستمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع تھا— عید کی اہمیت کیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ عید کا مقصد خدا کی نعمتوں کو یاد کرنا اور انسانی تعلقات کو فروغ دینا ہے۔ انٹرویور کا نام مسٹر انکت گپتا تھا۔

8- آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو میں 29 ستمبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی گئی۔ اِس تقریر کا موضوع تھا— عید الفطر کا پیغام۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ عید میل ملاپ کا تیوہار ہے۔ اِس سے سماجی تعلقات میں اضافہ ہوتا ہے اور انسانی اقدار کو فروغ دینے میں مدد ملتی ہے۔

9- 2 اکتوبر 2008 عید الفطر (1429 ہجری) کے موقع پر نمازِ عید کے بعد مختلف مساجد میں دعوتی لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ یہ لٹریچر اردو اور انگریزی زبان میں تھا۔ لوگوں نے اِس کو نہایت شوق سے لیا۔ نماز کے بعد سی پی ایس کے ممبران کے سامنے صدر اسلامی مرکز نے ایک گھنٹے کا خطاب کیا۔ یہ خطاب عید الفطر کی دعوتی اہمیت کے موضوع پر تھا۔ پروگرام کے خاتمے پر دعوہ ورک کو زیادہ منظّم انداز میں انجام دینے کے لیے مشورہ کیا گیا۔ مشورہ کے بعد دعا پر مجلس ختم ہوئی۔

10- سی پی ایس انٹرنیشنل اور آئی سی پی (نئی دہلی) کے تعاون سے ایک پروگرام ہوا۔ اِس کا عنوان یہ تھا:

Perspectives on peacemaking:
A Muslim and A Christian in Dialogue

یہ پروگرام 4 اکتوبر 2008 کو وائی ایم سی اے (نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی) کے ہال میں ہوا۔ اس کے مہمانِ خصوصی ایک امریکن پروفیسر ڈاکٹر ڈیوڈ (Dr. David W. Shenk) تھے۔ اِس پروگرام کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ اِس موقع پر وہاں سی پی ایس کی ٹیم کے افراد بھی موجود تھے۔ انھوں نے لوگوں سے انٹریکشن کیا اور ان کے درمیان بڑے پیمانے پر اردو اور انگریزی زبان میں چھپا ہوا دعوتی لٹریچر تقسیم کیا۔

11 - فاؤنڈیشن فار یونی ورسل رسپانسبلٹی (Foundation for Universal Responsibility) کی طرف سے 11 اکتوبر 2008 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (لودی روڈ، نئی دہلی) میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Seeking Meaning from Life in the Face of Death.

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور قرآن وحدیث کی روشنی میں موضوع پر ایک تقریر کی۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی ٹیم کے افراد بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے لوگوں کے درمیان انگریزی میں چھپا ہوا دعوتی لٹریچر تقسیم کیا۔ اسلام میں موت کا تصور (The Concept of Death in Islam) کے موضوع پر انگریزی زبان میں صدر اسلامی مرکز کا ایک لیکچر بھی ریکارڈ کرلیا گیا تھا۔ لٹریچر کے ساتھ اس کی کاپیاں بھی لوگوں کو دی گئیں۔

12 - اسپرچول میسج (The Spiritual Message) کی دعوت پر 14-13 اکتوبر 2008 کو صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ سی پی ایس کی ٹیم کے کچھ افراد بھی اِس سفر میں موجود تھے۔ انھوں نے بڑے پیمانے پر لوگوں سے انٹریکشن کیا اور ان کے درمیان دعوتی لٹریچر تقسیم کیا۔ اِس موقع پر بمبئی کے تقریباً ایک درجن سے زیادہ ٹی وی اور اخبار کے نمائندوں نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر اسلام اور امن تھا۔ میڈیا کے چند نمائندہ حوالوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے — سہارا سمے، سی ٹی وی، آئی ٹی این نیوز، سامنا ٹی وی، 9 زی نیوز، وی ٹائمس، نو بھارت، لائیو انڈیا، آج شہر میں، وغیرہ۔

13 - اسلام اور دہشت گردی کے موضوع پر 14 اکتوبر 2008 کو شاہی جامع مسجد کامپلکس (دہلی) میں ایک آل انڈیا کانفرنس ہوئی۔ اِس میں ہندستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے علما اور دانش وروں نے شرکت کی۔ اِس موقع پر سی پی ایس انٹرنیشنل سے وابستہ بعض افراد نے مختلف دعوتی اور فکری موضوعات پر صدر اسلامی مرکز کے لٹریچر اور سی ڈیز بڑے پیمانے پر لوگوں کے درمیان تقسیم کیے۔ پہلی بار سارا لٹریچر فوراً ختم ہوگیا۔ پھر دوبارہ بڑی تعداد میں وہاں لٹریچر پہنچایا گیا۔ الرسالہ مشن کے ساتھیوں نے بتایا کہ لوگوں نے اس کو بہت شوق سے لیا۔ جب دوبارہ لٹریچر وہاں پہنچا تو پیکٹ کھولتے ہی لوگ اُس پر ٹوٹ پڑے۔ وہاں گویا وہی منظر پیش آیا جس کو عام زبان میں لوٹ لینا کہا جاتا ہے۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ دعوتی لٹریچر کو لیا۔ ہمارے ساتھیوں کو اسے تقسیم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ خود مقررین حضرات نے سی ڈیز اور پمفلٹس کی کئی کئی کاپیاں حاصل کیں۔